ربیع الثانی 1433ھ
مارچ 2012ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ارکانِ اسلام

"اربعینِ نووی" کی ایک حدیث کی تفہیم

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

دینی وعصری علوم کی منفرد دانش گاہ

کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج)

(وفاق المدارس سے الحاق شدہ)

2012

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بورڈ/یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ درسِ نظامی کا مکمل نصاب

قیام وطعام کی سہولت موجود ہے

علمِ دین اور فکرِ حاضر کے حسین امتزاج کی ایک منفرد کوشش

خصوصیات

☆ تجربہ کار، اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین
☆ قرآنی موضوعات پر خصوصی فکری وعملی رہنمائی
☆ تعلیم وتربیت کا بہترین انتظام
☆ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے بہترین مواقع
☆ علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید علوم یعنی درس نظامی مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے
☆ اسباق وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ کے نصاب کے مطابق
☆ خوبصورت عمارت اور کلاس رومز
☆ کمپیوٹر لیب ☆ بہترین اور مکمل لائبریری
☆ کانفرنس اور مذاکرہ ہال
☆ اسلامی اخلاقیات کی مکمل پابندی
☆ رہائش کے لیے بہترین ہوادار اور روشن کمرے
☆ خوراک حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق
☆ طلبہ کی تدریسی ضروریات پوری کرنے میں معاونت
☆ وقت کا مؤثر استعمال
☆ مواقع تفریح کی فراہمی

نشستیں محدود ہیں!

مڈل کے امتحان کے نتائج کے منتظر طلبہ بھی درخواست جمع کرا سکتے ہیں

مقامی ودیگر شہروں کے طلبہ کے لیے درجہ اولیٰ وثانیہ (میٹرک) اور ثالثہ میں نئے تعلیمی سال کے داخلے جاری ہیں

معلومات داخلہ

☆ نئے سال کے لیے داخلہ کے خواہش مند طلبہ 15 مارچ سے کلیۃ القرآن آفس سے داخلہ فارم اور انٹری ٹیسٹ کے لیے سلیبس وصول کر سکتے ہیں۔
☆ داخلہ کے لیے انٹری ٹیسٹ اور انٹرویو پاس کرنا لازمی ہے۔ 26 مارچ کو انٹری ٹیسٹ اور انٹرویو ہوگا۔
☆ مزید معلومات کے لیے ناظم اعلیٰ کلیۃ القرآن یا نائب ناظم سے رابطہ کریں!
☆ امسال شوال میں داخلے نہیں ہوں گے۔

شرائط داخلہ

☆ درجہ اولیٰ کے لیے متوسط یا مڈل پاس، ثانیہ کے لیے نہم اور اولیٰ پاس اور ثالثہ کے لیے وفاق المدارس سے عامۃ اور بورڈ سے میٹرک پاس ہونا لازمی ہے۔
☆ دیگر تعلیمی اداروں سے کم از کم مڈل
☆ اپنے علاقے کے عالم دین سے یا سابقہ مدرسہ سے تصدیق نامہ
☆ سرپرست کی طرف سے ضمانت نامہ
☆ ٹیسٹ اور انٹرویو میں کامیابی

برائے رابطہ
ناظم اعلیٰ کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج) 191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35860024-35833637 (042)

ذیلی دفتر: قرآن اکیڈمی 36-K ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 3-35869501 (042)
فیکس: (042)35834000، ای میل: irs@tanzeem.org

مشمولات

عرضِ احوال —— 3

بلوچستان کا مسئلہ اور امریکی کانگریس کی قرارداد — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن —— 7

سورۃ الانفال (آیات ۱ تا ۱۹) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

منبر و محراب —— 26

ارکانِ اسلام — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

در دلِ مُسلم —— 45

حبِّ رسول ﷺ کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تعمیرِ سیرت —— 51

حسنِ نیت: نیک عمل کی اساس — عتیق الرحمٰن صدیقی

اسلامی معاشرت —— 61

حق مہر کے لیے قرآن حکیم میں وارد الفاظ — حافظ محمد مشتاق ربانی

آدابِ زندگی —— 65

سبّ وشتم: فساد کی جڑ اور بدترین گناہ — حافظ محمد زاہد

اقبالیات —— 75

کلامِ اقبال: قرآن کے ترازو میں (۲) — پروفیسر عبداللہ شاہین

تحریک تجدّد و متجدّدین —— 85

مولانا وحید الدین خان: اپنے الفاظ کے آئینے میں — حافظ محمد زبیر

❁ ❁ ❁

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمِیْثَاقَہُ الَّذِیْ وَاثَقَکُمْ بِہٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	61
شمارہ :	3
ربیع الثّانی	1433ھ
مارچ	2012ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک — 250 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش — 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ — 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ — 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلوچستان کا مسئلہ اور امریکی کانگریس کی قرارداد

کیلیفورنیا سے امریکی کانگریس کے ری پبلکن رکن ڈانا روہرابیکر نے بلوچ قوم کے اپنے ملک اور حقِ خودارادیت کے لیے جمعہ کو امریکی ایوانِ نمائندگان میں بِل متعارف کرایا ہے۔ مذکورہ بل میں کہا گیا ہے کہ بلوچستان کا علاقہ اس وقت پاکستان' ایران اور افغانستان میں تقسیم ہے اور بلوچ عوام کو کوئی خودمختارانہ حقوق حاصل نہیں ہیں' خصوصاً پاکستان میں بلوچوں کو تشدد اور ماورائے عدالت قتل کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ بل میں مزید کہا گیا ہے کہ بلوچ عوام کو اپنے آزاد و خودمختار ملک کے قیام کے لیے حق خودارادیت حاصل ہے اور انہیں اپنی حیثیت کے تعین کا موقع ملنا چاہیے۔ ڈانا روہرابیکر خارجہ امور پر سب کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم اس قرارداد پر تبصرہ کریں ہم بلوچستان کے حوالہ سے چند حقائق قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔ بلوچستان رقبہ کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کا رقبہ ۱۳۱٬۸۵۵ مربع میل ہے جو کل پاکستان کا ۴۴ فیصد ہے اور آبادی ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق ۶۶ لاکھ ہے جس میں اب تک چند لاکھ کا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ گویا آبادی کے لحاظ سے بلوچستان پاکستان کا سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔ یہاں ۵۵ فیصد بلوچ' چالیس فیصد پشتون اور پانچ فیصد پنجابی وغیرہ ہیں۔ بلوچستان کے شمال میں افغانستان، جنوب میں بحیرۂ عرب، مغرب میں ایران اور مشرق میں پاکستان کے دوسرے صوبے ہیں۔ بلوچستان کے بارے میں چھوڑا گیا نیا شوشہ کہ بلوچستان کو پاکستان میں جبراً شامل کیا گیا تھا یقیناً اغیار کا پروپیگنڈا ہے جس میں ہمارے کچھ تجزیہ نگار بھی بہہ گئے ہیں۔ حقائق یہ ہیں کہ برطانوی دور کے بلوچستان نے جمہوری انداز میں پاکستان سے الحاق کیا تھا، البتہ ریاست قلات کی اسمبلی نے پاکستان سے الحاق سے انکار کر دیا تھا۔ جغرافیائی اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قلات میں مزید تین ریاستیں لسبیلہ، خاران اور مکران تھیں۔ لسبیلہ کے جام غلام قادر نے بالکل آغاز ہی میں پاکستان سے الحاق کا غیر مشروط اعلان کر دیا تھا' البتہ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہوگا کہ وہ جب تک زندہ رہے روتے رہے' کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں کوئی مظلوم نہیں صرف پاکستان مظلوم ہے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو خاران کی ریاست نے بھی پاکستان سے الحاق کر لیا۔ خان آف قلات نے وہاں کی اسمبلی کو پاکستان سے الحاق کے لیے

ترغیب و تشویق دلائی لیکن ارکان راضی نہ ہوئے۔ ایک موقع پر انہوں نے اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نیا نیا معرضِ وجود میں آیا ہے اور بہت سی مشکلات کا شکار ہے' مہاجرین کا مسئلہ ہے' کشمیر کا تنازعہ' بھارت سے تصادم کا خطرہ ہے' لیکن بات پھر بھی نہ بنی۔ بہرحال ۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو انہوں نے کراچی میں پاکستان سے الحاق کی دستاویزات پر دستخط کر دیے۔ ایک روایت کے مطابق انہیں خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرے نام سے ایک ملک وجود میں آیا ہے' تم بھی اس میں شامل ہو جاؤ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خواب کی وجہ سے یا حکومتی دباؤ کی وجہ سے انہوں نے الحاق کی دستاویزات پر دستخط کر دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سادہ لوح بلوچوں کا خلوص سے پاکستان سے الحاق کرنے کا عملی طور پر مذاق اڑایا۔

بلوچستان میں پاکستان سے نفرت کی آگ بھڑکانے میں مفاد پرست سیاست دانوں اور مغرور و متکبر سول اور فوجی بیوروکریسی نے کلیدی رول ادا کیا۔ پاکستان کی جمہوری اور فوجی حکومتیں اب تک بلوچستان میں پانچ ملٹری آپریشن کر چکی ہیں۔ پہلا آپریشن ریاست قلات میں کیا گیا جس پر جھالاوان میں خان آف قلات کے بھائی پرنس عبدالکریم نے علمِ بغاوت کھڑا کیا اور وہ اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں پر چلے گئے۔ قرآن کو ضامن بنا کر انہیں یقین دہانی کرائی گئی کہ وہ ہتھیار پھینک دیں تو عام معافی دے دی جائے گی' لیکن وعدہ خلافی کرتے ہوئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت تک تو انگریز فوجی افسران موجود تھے جنہوں نے یہ غیر اخلاقی غیر قانونی حرکت کی۔ لیکن ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایوب خانی مارشل لاء کے دوران پھر آپریشن ہوا۔ قلات کی مرکزی جامع مسجد پر بمباری کی گئی۔ خان آف قلات ہاتھ میں قرآن لے کر باہر آئے۔ اس آپریشن کے دوران نواب نوروز خان مسلح ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں پر چلے گئے۔ انہیں بھی قرآن پر حلف دے کر نیچے اتارا گیا' ایک بار پھر وعدہ خلافی ہوئی' بوڑھے نوروز خان کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے بیٹوں کو پھانسی دے دی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں تیسرا فوجی آپریشن مری قبیلہ کے خلاف کیا گیا۔ جان شیر محمد مری المعروف جنرل شیروف نے مزاحمت کی۔ ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی اور جمہوری حکومت نے انتہائی بودے انداز میں فوجی آپریشن کیا۔ عطاء اللہ مینگل کی صوبائی حکومت کو سول آمر بھٹو نے اختیارات کا غلط استعمال کر کے ختم کر دیا اور بلوچستان کے خلاف آپریشن ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ اس آپریشن کے بعد ایک طویل عرصہ تک بلوچستان میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ۲۰۰۶ء میں پرویز مشرف کے دور میں بلوچستان کے خلاف بدترین فوجی آپریشن ہوا۔ اِسی سال ۲۶/ اگست کو سردار اکبر بگٹی جو بلوچ قوم پرستوں میں ایک پرو پاکستان سردار تھے' انہیں بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس بے جواز قتل کا بلوچستان میں شدید ردِّعمل ہوا ہے اور یوں

معلوم ہوتا ہے کہ بلوچیوں اور وہاں کے دوسرے قوم پرستوں کے ساتھ معاملات پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ چکے ہیں یا پہنچنے کو ہیں۔ بلوچیوں کو اس وقت سب سے بڑی شکایت لاپتہ افراد کے حوالے سے ہے جن کی مسخ شدہ لاشیں بعد ازاں ویرانوں سے ملتی ہیں۔ یہ سنگین صورت حال اس لیے پیدا ہوئی کہ پاکستان میں قانون کی بالادستی کا کوئی تصور نہیں اور پاکستان کی انتظامیہ اور عدلیہ اس حوالہ سے ڈلیور کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہیں۔ اور یہ حق بات کہی جانی چاہیے کہ بلوچوں نے اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک غلط راستہ اختیار کر لیا' اُنہوں نے پنجابیوں اور غیر مقامی لوگوں کی ٹارگٹ کلنگ شروع کر دی۔ ایسے میں حکومت اور سیکیورٹی اداروں کا فرض تھا کہ قاتلوں اور مجرموں کو گرفتار کرتے اور عدالتی کارروائی کے ذریعے انہیں عبرتناک انجام تک پہنچاتے' لیکن انہوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لہٰذا لوگ اغوا ہوتے ہیں اور ان کی مسخ شدہ لاشیں ویرانوں سے ملتی ہیں۔ ہماری رائے میں انتظامیہ اور ایجنسیوں کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکو کے گھر میں ڈاکہ ڈال دیں یا قاتل کو سرِ راہ قتل کر دیں۔ اُن پر لازم تھا کہ وہ قانونی راستہ اختیار کرتے۔

آج پاکستانی قوم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے اور وہ غیظ و غضب کا اظہار کر رہی ہے کہ کانگریس کے ری پبلکن رکن نے بلوچوں کی آزادی کے حوالہ سے قرارداد کیوں پیش کی۔ اگرچہ امریکی حکومت نے اس قرارداد سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا ہے' لیکن امریکہ کا ماضی یہ ہے کہ وہ کسی بھی عالمی سطح کی واردات سے پہلے اس طرح کی قراردادیں اپنی کانگریس میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب کوئی فرد' گروہ یا ریاست کمزور ہو' دوسروں کی محتاج ہو' باہمی طور پر دست و گریبان ہو اور نظریاتی طور پر منحرف ہو چکی ہو تو پھر غیروں کی مداخلت کو روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ ایک بات ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سردار اکبر بگٹی کو قتل ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ' افراد کا گم ہونا اور ان کی مسخ شدہ لاشوں کا ملنا بھی ایک عرصہ سے جاری ہے۔ براہمداغ بگٹی' خیر بخش مری اور دوسرے بہت سے قبائلی سردار مشرف دور سے بلوچستان کا حل پاکستان سے علیحدگی اور مکمل آزادی سمجھتے ہیں اور اس کا سرِعام اعلان کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے' لیکن آئی ایس آئی اور سی آئی اے کے اختلافات کے بعد عالمی سطح پر بلوچستان کے حوالہ سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا اب اچانک عروج پر پہنچ گیا ہے اور عالمی سطح پر میڈیا میں اس حوالہ سے بہت شور و غوغا ہو رہا ہے جس میں ہمارا میڈیا بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے میڈیا کو اپنے تئیں بلوچستان کے مسئلے کو شروع سے ہی اٹھانا چاہیے تھا اور نہ صرف بھرپور بلکہ جارحانہ انداز سے اٹھانا چاہیے تھا' لیکن ہمارے میڈیا خصوصاً الیکٹرونک میڈیا کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ ملکی مفاد کو تج کرتے ہوئے اور حالات کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے

اکثر عالمی میڈیا کے ساتھ اپنی آواز ملانے کے لیے شامل باجا ہو جاتا ہے۔ عالمی کھلاڑیوں کے مطالبات اگر آج حکومت اور مقتدر ادارے تسلیم کر لیتے ہیں تو وہ دوبارہ بلوچستان کے حوالہ سے خاموشی اختیار کر لیں گے۔

اب آیئے اس قرارداد کی طرف جو امریکی ایوانِ نمائندگان میں پیش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اہم ترین بات اس کی ٹائمنگ ہے۔ یہ ۱۷ فروری کو اس روز پیش کی گئی جب PIA (PAKISTAN-IRAN-AFGHANISTAN) کا سربراہی اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہو رہا تھا۔ یہ دباؤ کی سیاست جو امریکہ کمزور ممالک کے خلاف پون صدی سے کرتا چلا آ رہا ہے اس کا حصہ ہے۔

ہماری رائے میں اس قرارداد کے ذریعے حکومت پاکستان سے امریکہ کے جو فوری مطالبات سامنے آئیں گے وہ نیٹو سپلائی کی زمینی ذرائع سے بحالی' ڈاکٹر شکیل آفریدی کی رہائی اور اسے امریکہ آنے کی اجازت' ایران سے گیس معاہدے کی منسوخی جیسے مطالبات ہوں گے۔ پھر ان مطالبات کو منوانے کے بعد ''ڈومور'' کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اگر حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ سمجھ چکا ہے کہ افغانستان میں اس کے قدم نہیں جم سکتے۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ اگر اسے اپنی افواج کو افغانستان سے واپس بلانا بھی پڑا تو کم از کم وہ اس حد تک ضرور کامیاب ہو جائے گا کہ افغانستان میں طالبان اور دوسرے سٹیک ہولڈرز سے یہ بات منوا لے کہ اسے افغانستان میں فوجی اڈے رکھنے کا حق حاصل رہے گا۔ اب وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کا یہ مطالبہ بھی طالبان تسلیم نہیں کریں گے' لہٰذا وہ افغانستان میں اڈے برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ خطّے میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس نے افغانستان کی بجائے بلوچستان کا انتخاب کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ چین کے محاصرے' وسطی ایشیا میں اثر و رسوخ اور پاکستان و ایران پر گہری نظر رکھنے کے لیے امریکہ کے لیے بلوچستان آئیڈیل جگہ ہے۔ پھر مالی بحران کی طرف بڑھتے ہوئے امریکہ کو بلوچستان جیسی سرزمین کی ضرورت ہے جس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ معدنی وسائل کے حوالہ سے بلوچستان دنیا کا امیر ترین علاقہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بلوچستان کے حوالے سے امریکہ کے ناپاک عزائم کو بھی ناکام بنایا جائے' لیکن میڈیا سمیت پاکستان کے تمام طبقات بلوچستان کے عوام کے حقوق کی بحالی تک آواز بھی لازماً اُٹھاتے رہیں۔ آخر میں ہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جلتا سلگتا بلوچستان ہو یا پاکستان کے دوسرے مسائل حل کرنے کا معاملہ ہو' نظریاتی طور پر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے بغیر ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔oo

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الانفَال

تمہیدی کلمات

سورۃ الانفال مدنی سورت ہے اور اس کا سورۃ التوبہ (مدنی) کے ساتھ جوڑا ہونے کا تعلق ہے۔ اس گروپ کی چاروں سورتوں میں معنوی ربط یوں ہے کہ پہلی دو مکی سورتوں (الانعام اور الاعراف) میں مشرکینِ عرب پر رسول اللہ ﷺ کی مسلسل دعوت کے ذریعے اتمامِ حجت ہوا' اور بعد کی دو مدنی سورتوں (الانفال اور التوبہ) میں اس اتمامِ حجت کے جواب میں ان لوگوں پر عذاب کا تذکرہ ہے۔ موضوع کی اس مناسبت کی بنا پر یہ چاروں سورتیں دو دو کے دو جوڑوں کے ساتھ ایک گروپ بناتی ہیں۔

سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے متصلاً بعد اور سورۂ آلِ عمران کے اکثر حصے سے پہلے نازل ہوئی۔ چنانچہ اس سورت کے مطالعے سے پہلے غزوۂ بدر کے پس منظر کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ اور اس پس منظر کے مطالعہ سے بھی پہلے نبی اکرم ﷺ کی دعوتی و انقلابی تحریک کے منہج و مراحل کے حوالے سے غزوۂ بدر کی خصوصی اہمیت اور حیثیت کا تعین بھی ضروی ہے۔ چنانچہ جب ہم غزوۂ بدر کو قرآن کے فلسفۂ تذکیر بایّام اللہ اور سورۃ الانفال کے خصوصی تناظر میں دیکھتے ہیں تو اس کے مندرجہ ذیل دو بہت اہم پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) مشرکینِ مکّہ پر عذاب کا پہلا کوڑا: اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق رسولوں کا انکار کرنے والی اقوام پر اجتماعی طور پر عذابِ استیصال نازل ہوتا رہا ہے۔ اسی قانونِ قدرت کا اطلاق ہجرت کے بعد مشرکینِ مکہ پر بھی ہونے والا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے بارہ تیرہ برس تک مختلف انداز میں دعوت دے کر اپنی قوم پر اتمامِ حجت کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے لیے ہجرت کا حکم گویا ایک واضح اشارہ تھا کہ مشرکین مکہ اپنے مسلسل انکار کے باعث اب عذاب کے مستحق

ہو چکے ہیں' لیکن حکمتِ الٰہی کے پیش نظر قریش کا معاملہ اپنی نوعیت میں اس لحاظ سے منفرد رہا کہ ان پر عذاب یکبارگی ٹوٹ پڑنے کے بجائے بالاقساط نازل ہوا۔ لہٰذا اس عذاب کی قسط اوّل اُن پر بدر کے میدان میں نازل ہوئی۔ انہیں حرمِ مکہ سے نکال کر میدانِ بدر میں بالکل اسی طرح سے لایا گیا جیسے آلِ فرعون کو اُن کے محلات سے نکالا گیا تھا اور سمندر میں لا کر غرق کر دیا گیا تھا۔

میدانِ بدر میں قریش کے ستّر سردار مارے گئے' ستّر افراد قیدی بنے اور متعدد زخمی ہوئے۔ یہ انجام ان جنگجوؤں کا ہوا جو فنِ حرب کی مہارت اور بہادری میں پورے عرب میں مشہور تھے' اپنے دور کے جدید ترین اسلحہ سے لیس اور تعداد میں اپنے حریف لشکر سے تین گنا تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ تین سو تیرہ میں سے صرف آٹھ افراد کے پاس تلواریں تھیں۔ ان نہتے تین سو تیرہ مجاہدین کے ہاتھوں ایک ہزار کے مسلح لشکر کی یہ ذلت اور ہزیمت دراصل قریش مکہ کے لیے عذابِ الٰہی کی پہلی قسط تھی' جس کا ذکر سورۃ الانفال میں ہوا ہے۔ (اس عذاب کا آخری مرحلہ سن ۹ ہجری میں آیا' جس کا ذکر سورۃ التوبہ میں ہے۔)

(۲) غلبۂ دین کی جدّوجُہد کا حتمی اور ناگزیر مرحلہ (اقدام): غزوۂ بدر رسول اللہ ﷺ کی غلبۂ دین کی جدوجہد کے پانچویں اور آخری مرحلے یعنی حق و باطل کے درمیان باقاعدہ تصادم کا نقطہ آغاز تھا اور اس مرحلے کو سر کرنے کے بعد یہ تحریک بالآخر تاریخِ انسانی کے عظیم ترین اور جامع ترین انقلاب پر منتج ہوئی۔ اس تحریک کے ابتدائی چار مراحل یعنی دعوت' تنظیم' تربیت اور صبرِ محض تو مکہ مکرمہ میں طے ہو گئے تھے۔ اس سلسلے کے چوتھے مرحلے (صبرِ محض) کا تذکرہ سورۃ النساء کی آیت ۷۷ میں ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ کے الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اپنے ہاتھ باندھ کر رکھو' یعنی تمہارے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو بھی تمہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے' حتیٰ کہ مدافعانہ کارروائی کی بھی اجازت نہیں ہے۔

ان چار مراحل کو کامیابی سے طے کرنے کا نتیجہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جاں نثاروں کی ایک مختصر مگر انتہائی مضبوط جماعت تیار ہو گئی تھی' جو سرد و گرم چشیدہ تھے' ہر طرح کی سختیاں جھیل چکے تھے' ہر قسم کی قربانیاں دے چکے تھے اور ان کے اخلاص مع اللہ میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس تربیت یافتہ' منظّم اور مضبوط جماعت کی تیاری کے بعد اب باطل کو للکارنے کا وقت قریب آ چکا تھا۔ لہٰذا مدینہ کی طرف ایک کھڑکی کھول کر دارالہجرت کا انتظام کر دیا گیا' تاکہ یہ ساری قوت ایک جگہ مجتمع ہو کر آخری مرحلے (اقدام) کے لیے تیاری کر سکے اور یہی وجہ تھی کہ یہ ہجرت تمام اہلِ ایمان پر فرض کر دی گئی تھی۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا

جائے تو یہ ہجرت فرار (flight) نہیں تھی' جیسا کہ مغربی مؤرخین اسے یہ نام دیتے ہیں' بلکہ ایک باقاعدہ سوچی سمجھی' طے شدہ حکمت عملی تھی' جس کے تحت اس تحریک کے ہیڈ کوارٹرز کو متبادل base کی تلاش میں مکہ سے مدینہ منتقل کیا گیا' تاکہ وہاں سے فیصلہ کن انداز میں اقدام کیا جاسکے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس موضوع پر میری کتاب ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'')۔

یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اٹھارہویں صدی میں مغربی علوم وتہذیب کی شدید یلغار کے سامنے مسلمان ہر میدان میں پسپا ہوتے چلے گئے' چنانچہ جب مغرب کی طرف سے یہ الزام لگایا گیا کہ ع ''بُوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' یعنی یہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو اس کے جواب میں ہمارے کچھ بزرگوں کی طرف سے پورے خلوص کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا۔ شاید یہ اس وقت کے حالات کی وجہ سے مجبوری بھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں محکومی وغلامی کی حالت میں مسلمان خصوصی طور پر انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان حالات میں کچھ مسلمان رہنما ایک طرف اپنی قوم کے تحفظ کے بارے میں فکرمند تھے تو دوسری طرف وہ اسلام اور سیرت النبی ﷺ کا دفاع بھی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس الزام کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ نے خود سے کوئی ایسا جارحانہ اقدام نہیں کیا' بلکہ تمام جنگیں آپ ﷺ پر مسلط کی گئی تھیں اور آپ ﷺ نے تمام جنگیں اپنے دفاع میں لڑیں۔

ہندوستان میں ان خطوط پر سب سے زیادہ کام علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ وہ سرسیّد احمد خان کے زیر اثر تھے اور یہ سب لوگ مل کر جدید مغربی افکار وخیالات' تہذیب وتمدن اور اقدار ونظریات کے طوفان کا خلوصِ نیت سے مقابلہ کر رہے تھے' جو بہرحال کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں انہیں معذرت خواہانہ (apologetic) انداز اختیار کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ''سیرت النبی ﷺ'' تحریر کرتے ہوئے غزوۂ بدر سے پہلے کی آٹھ مہمّات (جن میں چار غزوات اور چار سرایہ تھیں) کو تقریباً نظرانداز کر دیا ہے' تاکہ یہ ثابت نہ ہو کہ پہل کا اقدام (initiative) حضور اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا تھا۔

مذکورہ مصلحت آمیز حکمت عملی ایک خاص دور کا تقاضا تھی' لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ آج اسلام کا یہ فکر وفلسفہ پوری وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جو انسانی معاشرے میں عملی تنفیذ کے لیے اپنا غلبہ چاہتا ہے اور حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی دین کو غالب کرنا تھا۔ اسی طرح دین کو غالب کرنے کی اس

انقلابی جدّوجہد کی آج بھی ضرورت ہے۔ یہ جدّوجہد جب بھی اور جہاں بھی شروع کی جائے گی اس کے لیے منظّم انداز میں تیاری کی ضرورت ہوگی۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' سیرتِ مطہّرہ کی روشنی میں تیاری کا یہ کٹھن سفر بتدریج پانچ مراحل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے' یعنی دعوت' تنظیم' تربیت' صبر محض اور اقدام۔ اگر پہلے چار مراحل کامیابی سے طے کر لیے جائیں تو اس کے بعد یہ جدّوجہد آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے جس میں باطل کو للکار کر اس سے ٹکر لی جاتی ہے۔ اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ حق اور باطل دو ایسی متضاد اور متحارب قوتیں ہیں جو متوازی انداز میں نہیں چل سکتیں۔ دونوں میں بقائے باہمی (co-existence) کے اصول پر مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک قوت غالب ہوگی تو دوسری کو لازمی طور پر مغلوب ہونا پڑے گا۔ لہٰذا اگر حق اور اہلِ حق طاقتور ہیں تو وہ کسی قیمت پر باطل سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حالات کی نزاکت کے تحت منکرینِ زکوٰۃ کے ساتھ رعایت کرنے کے مشورے کے جواب میں فرمایا تھا: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ (کیا دین میں ترمیم کی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں!)۔ لہٰذا سورۃ الانفال کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فلسفے کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھنا اور ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

غزوۂ بدر کا پس منظر: مدینہ تشریف لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے داخلی استحکام پر ترجیحی طور پر توجہ مرکوز فرمائی۔ اس سلسلے میں پہلے چھ ماہ میں آپ ﷺ نے تین انتہائی اہم امور سرانجام دیے۔ اوّلاً آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر مکمل کروائی' جس کی صورت میں آپ ﷺ کو ایک ایسا مرکز میسر آ گیا جو بیک وقت ایک گورنمنٹ سیکرٹیریٹ بھی تھا اور پارلیمنٹ ہاؤس بھی' دارالعلوم اور خانقاہ بھی تھا اور عبادت گاہ بھی۔ ثانیاً آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار میں مواخات کا رشتہ قائم کرا دیا' جس سے نہ صرف مہاجرین کے معاشی ومعاشرتی مسائل حل ہو گئے' بلکہ مدینہ میں ان دونوں فریقوں کے افراد پر مشتمل ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جس کے افراد باہمی محبت اور اخلاص کے گہرے رشتہ میں منسلک تھے۔ اس سلسلے کا تیسرا اور اہم ترین کارنامہ میثاقِ مدینہ تھا۔ یعنی یہودی قبائل کے ساتھ مدینہ کے مشترک دفاع کا معاہدہ' جس کے تحت حملے کی صورت میں مدینہ کے یہودی قبائل مسلمانوں کے ساتھ مل کر شہر کا دفاع کرنے کے پابند ہو گئے۔

داخلی محاذ پر ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد ہجرت کے ساتویں ماہ سے آپ ﷺ نے مدینہ کے اطراف وجوانب میں چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قریشِ مکہ کی معیشت

کا دارومدار تجارت پر تھا اور مکہ سے یمن اور شام کی طرف اُن کے تجارتی قافلے سارا سال رواں دواں رہتے تھے۔ یہ دونوں تجارتی شاہراہیں قریش مکہ کی معیشت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ ﷺ نے اِن دونوں شاہراہوں پر اپنے فوجی دستوں کی نقل وحرکت سے قریش کو یہ باور کرا دیا کہ ان کی یہ معاشی شہ رگ اب ہماری زد میں ہے اور ہم جب چاہیں اسے کاٹ سکتے ہیں۔ اپنی معیشت کے بارے میں ایسے خدشات کا تصور قریش کے لیے بہت ہی بھیانک تھا۔ غزوۂ بدر (۲ ہجری) سے پہلے' ڈیڑھ سال کے دوران میں ایسی آٹھ مہمات کا بھیجا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ ان میں سے چار مہمات میں رسول اللہ ﷺ کی بنفسِ نفیس شرکت بھی ثابت ہے۔ آپ ﷺ جن جن علاقوں میں تشریف لے گئے وہاں پر آباد قبائل کے ساتھ آپ ﷺ نے دوستی کے معاہدے کر لیے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے اطراف وجوانب میں آباد اکثر قبائل جو پہلے قریش کے دوست تھے اب مسلمانوں کے حلیف بن گئے' جبکہ کچھ قبائل نے غیر جانبدار رہنے کے معاہدے کر لیے' اور یوں آپ ﷺ کی کامیاب حکمت عملی سے مدینہ کے مضافاتی علاقوں سے قریش کا دائرۂ اثر سکڑنے لگا۔ قریش کے لیے مکہ کی معاشی ناکہ بندی کا خدشہ ہی کچھ کم پریشان کن نہیں تھا کہ اب انہیں اس علاقے سے اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بساط بھی لپٹتی ہوئی دکھائی دینے لگی' چنانچہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق وہ مدینہ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے منصوبہ بندی کرنے لگے۔ اسی دوران میں دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے حالات تیزی سے خراب ہو کر غزوۂ بدر پر منتج ہوئے۔

پہلا واقعہ یوں ہوا کہ حضور ﷺ نے ایک چھوٹا سا دستہ نخلہ کے مقام پر بھیجا جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ ان لوگوں کو یہ مشن سونپا گیا کہ وہ اس علاقے میں موجود رہیں اور قریش کی نقل وحرکت کے بارے میں مطلع کرتے رہیں۔ اتفاق سے اس دستے کی مڈبھیڑ قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہوگئی۔ مقابلے میں ایک مشرک عبداللہ بن حضرمی مارا گیا جبکہ ایک دوسرے مشرک کو قید کر لیا گیا۔ مالِ غنیمت اور قیدی کے ساتھ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا' کیونکہ ایسا کرنے کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا' لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ گویا مسلمانوں کی طرف سے قریش کے خلاف پہلا باقاعدہ مسلّح اقدام تھا جس میں ان کا ایک شخص بھی قتل ہوا۔ لہٰذا اس واقعہ سے ماحول کی کشیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

دوسرا واقعہ ابوسفیان کے قافلے سے متعلق ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تھا جو مکہ سے شام کی طرف جا رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کا تعاقب کیا' مگر وہ لوگ بچ نکلنے میں

کامیاب ہو گئے۔ جب یہ قافلہ پچاس ہزار دینار کی مالیت کے ساز وسامان کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا تو ممکنہ خطرے کے پیش نظر ابوسفیان نے قافلے کی حفاظت کے لیے دوہری حکمت عملی اختیار کی۔ انہوں نے ایک طرف تو ایک تیز رفتار سوار کو اپنے تحفظ کی خاطر مدد حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ کیا اور دوسری طرف معمول کا راستہ جو بدر کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا' اس کو چھوڑ کر قافلے کو مدینہ سے دور ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ نکال کر لے گئے۔ بہرحال اتفاق سے مکہ میں یہ دونوں اشتعال انگیز خبریں یکے بعد دیگرے پہنچیں۔ ایک طرف نخلہ سے جان بچا کر بھاگنے والے افراد روتے پیٹتے عبداللہ بن حضرمی کے قتل کی خبر لے کر پہنچ گئے اور دوسری طرف ابوسفیان کا ایلچی بھی دہائی دیتے ہوئے آ پہنچا کہ بھاگو! دوڑو! کچھ کر سکتے ہو تو کرو' تمہارا قافلہ مسلمانوں کے ہاتھوں لٹنے والا ہے۔ ان خبروں سے مکہ میں تو گویا آگ بھڑک اٹھی۔ چنانچہ فوری طور پر ایک ہزار کا لشکر تیار کیا گیا جس کے لیے ایک سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ اور نو سو اونٹ مہیا کیے گئے' وافر مقدار میں سامانِ رسد اور اسلحہ وغیرہ بھی فراہم کیا گیا۔

مشاورت کے بارے میں غلط فہمی کی وضاحت: غزوۂ بدر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جس مشاورت کا ذکر قرآن حکیم اور تاریخ میں ملتا ہے اس کے بارے میں اکثر لوگ مغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دو مواقع اور دو مقامات پر الگ الگ مشاورت کا انعقاد فرمایا تھا مگر اسے اکثر و بیشتر لوگوں نے ایک ہی مشاورت سمجھا ہے۔

پہلی مجلس مشاورت مدینہ میں ہوئی اور اس کا مقصد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ابوسفیان کے قافلے کو شام سے واپسی پر روکنا چاہیے یا نہیں؟ اور جب مشورہ کے بعد اس سلسلے میں اقدام کرنا طے پایا تو آپ ﷺ کچھ صحابہؓ کو لے کر اس مقصد کے لیے مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ چونکہ اس وقت تک جنگ کے بارے میں کوئی گمان تک نہیں تھا اس لیے اس مہم کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی تھی۔ جس کے ہاتھ میں جو آیا وہ لے کر چل پڑا۔ چنانچہ دو گھوڑوں' آٹھ تلواروں اور کچھ چھوٹے موٹے ہتھیاروں کے ساتھ چند صحابہؓ کی معیت میں جب آپ ﷺ مقامِ صفراء پر پہنچ گئے تو آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ ابوجہل ایک ہزار کا لشکر لے کر مکہ سے چل پڑا ہے۔ اور اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آ گئی کہ جنوب (مکہ) کی طرف سے ایک لشکر آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے جبکہ شمال کی جانب سے قافلہ' اور میرا یہ وعدہ ہے کہ ان دونوں میں

سے ایک پر آپ ﷺ کو ضرور فتح حاصل ہوگی۔ لہٰذا اہل ایمان کو خوشخبری بھی دیں اور ان سے مشورہ بھی کریں۔ چنانچہ اس وحی کے بعد مقامِ صفراء پر آپ ﷺ نے یہ فیصلہ کرنے کے لیے دوسری مشاورت کا انعقاد فرمایا کہ پہلے لشکر کے مقابلے کے لیے جایا جائے یا قافلے کو روکنے کے لیے؟ چنانچہ جن محققین اور مفسرین سے اس پس منظر کی تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے اور انہوں نے مشاورت کے دو واقعات کو ایک ہی واقعہ سمجھا ہے' انہیں اس سورت کی متعلقہ آیات کو سمجھنے اور ان کا ترجمہ وتشریح کرنے میں بہت خلجان رہا ہے۔

سورت کے اسلوب کا ایک خاص انداز: یہ سورت دس رکوعات پر مشتمل ایک مکمل خطبہ ہے' لیکن اس میں سے ایک خاص مسئلہ کو درمیان سے نکال کر آغاز میں لایا گیا ہے' یعنی مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس مسئلہ کی تفصیلات سورت کے اندر اپنی جگہ پر ہی بیان ہوئی ہیں' لیکن اس موضوع کو اتنی اہمیت دی گئی کہ سورت کا آغاز غیر معمولی انداز میں اس کے ذکر سے کیا گیا۔ یہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ اس لیے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آیا کہ غزوۂ بدر جزیرہ نمائے عرب میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے عرب میں کہیں بھی کسی باقاعدہ فوج اور اس کے ڈسپلن کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ چنانچہ عسکری نظم وضبط اور جنگی معاملات کے بارے میں کوئی ضابطہ اور قانون بھی پہلے سے موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس غزوہ میں فتح کے بعد میدانِ جنگ سے جو چیز جس کے ہاتھ لگ گئی' اس نے سمجھا کہ بس اب یہ اس کی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے بہت سنجیدہ نوعیت کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بعض لوگوں نے تو بھاگ دوڑ کر کے بہت زیادہ مال جمع کر لیا' جبکہ مختلف وجوہات کی بنا پر کچھ لوگوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ لگا۔ کچھ لوگ اپنی بزرگانہ حیثیت اور وضع داری کی بنا پر بھاگ دوڑ کر مال اکٹھا نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ لوگ اہم مقامات پر پہرہ دے رہے تھے اور بعض رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور تھے۔ مالِ غنیمت میں سے ایسے تمام لوگوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ضمن میں اختلافات پیدا ہوئے۔ چنانچہ سورت کی پہلی آیت میں ہی جتلا دیا گیا کہ اللہ کے ہاں اس معاملے کا خاص نوٹس لیا گیا ہے اور پھر بات بھی اس طرح سے کی گئی کہ مسئلے کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی گئی۔ بالکل دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا کہ مالِ غنیمت صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کا ہے' کسی اور کا اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔ سورۃ الانفال کا یہ اسلوب اگر اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے تو اس سے ہمیں سورۃ التوبہ کے مضامین کی ترتیب کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

آیات ۱ تا ۸

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا
ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ
الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا
وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ
كَرِيْمٌ ۝۴ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ
يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ
ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

آیت ۱ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے اموالِ غنیمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں' آپ کہیے کہ اموالِ غنیمت کُل کے کُل اللہ اور رسولؐ کے ہیں۔''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱﴾ ''پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور اپنے آپس کے معاملات درست کرو' اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مؤمن ہو۔''

یہاں مالِ غنیمت کے لیے لفظ ''انفال'' استعمال کیا گیا ہے۔ انفال جمع ہے نفل کی اور نفل کے معنی ہیں اضافی شے۔ مثلاً نمازِ نفل' جسے ادا کر لیں تو باعث ثواب ہے اور اگر ادا نہ کریں تو مواخذہ

نہیں۔اسی طرح جنگ میں اصل مطلوب شے تو فتح ہے جب کہ مالِ غنیمت ایک اضافی انعام ہے۔

جیسا کہ تمہیدی گفتگو میں بتایا جا چکا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ سنجیدہ صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہاں ایک مختصر قطعی اور دوٹوک حکم کے ذریعے سے اس مسئلہ کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور بہت واضح انداز میں بتا دیا گیا ہے کہ انفال کُل کے کُل اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملکیت ہیں۔اس لیے کہ یہ فتح تمہیں اللہ کی خصوصی مدد اور اللہ کے رسولؐ کے ذریعے سے نصیب ہوئی ہے۔لہٰذا انفال کے حق دار بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی ہیں۔اس قانون کے تحت یہ تمام غنیمتیں اسلامی ریاست کی ملکیت قرار پائیں اور تمام مجاہدین کو حکم دے دیا گیا کہ انفرادی طور جو چیز جس کسی کے پاس ہے وہ اسے لا کر بیت المال میں جمع کرا دے۔اس طریقے سے سب لوگوں کو zero level پر لا کر کھڑا کر دیا گیا اور یوں یہ مسئلہ احسن طور پر حل ہو گیا۔اس کے بعد جس کو جو دیا گیا اس نے وہ بخوشی قبول کر لیا۔

اگلی آیات اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان میں بندۂ مومن کی شخصیت کے کچھ خدوخال بیان ہوئے ہیں۔مگر ان خدوخال کے بارے میں جاننے سے پہلے یہ نکتہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ''مؤمن'' اور ''مسلمان'' دو مترادف الفاظ یا اصطلاحات نہیں ہیں۔قرآن ان دونوں میں واضح فرق کرتا ہے۔ یہ فرق سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ بدو لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں جبکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔اسلام اور ایمان کا یہ فرق اچھی طرح سمجھنے کے لیے ''ارکانِ اسلام'' کی تفصیل ذہن میں تازہ کر لیجئے جو قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا کا مرحلۂ اولیٰ طے کرنے کے لیے ضروری ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اُس کے بندے اور رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام ودعائمه العظام۔ واللفظ للمسلم۔

کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

یہ پانچ ارکانِ اسلام ہیں' جن سے ہر مسلمان واقف ہے۔مگر جب ایمان کی بات ہو گی تو ان پانچ ارکان کے ساتھ دو مزید ارکان اضافی طور پر شامل ہو جائیں گے' اور وہ ہیں دل کا یقین اور عمل میں جہاد۔ چنانچہ ملاحظہ ہو سورۃ الحجرات کی اگلی آیت میں بندۂ مؤمن کی شخصیت کا یہ نقشہ: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ ''مؤمن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر' پھر ان کے دلوں میں شک باقی نہ رہے اور وہ جہاد کریں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔صرف وہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں''۔یعنی کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد انسان قانونی طور پر مسلمان ہو گیا اور تمام ارکانِ اسلام اس کے لیے لازمی قرار پائے۔مگر حقیقی مؤمن وہ تب بنے گا جب اُس کے دل کو گہرے یقین ﴿ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ والا ایمان نصیب ہو گا اور عملی طور پر وہ جہاد میں بھی حصہ لے گا۔

بندۂ مؤمن کی اسی تعریف (definition) کی روشنی میں اہلِ ایمان کی کیفیت یہاں سورۃ الانفال میں دو حصوں میں الگ الگ بیان ہوئی ہے۔وہ اس طرح کہ حقیقی ایمان والے حصے کی کیفیت کو آیت ۲ اور ۳ میں بیان کیا گیا ہے' جبکہ اس کے دوسرے (جہاد والے) حصے کی کیفیات کو سورت کی آخری آیت سے پہلے والی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پرکار (compass) کو کھول دیا گیا ہو' جس کی ایک نوک سورت کے آغاز پر ہے (پہلی آیت چھوڑ کر) جبکہ دوسری نوک سورت کے آخر پر ہے (آخری آیت چھوڑ کر)۔اس وضاحت کے بعد اب ملاحظہ ہو بندۂ مؤمن کی تعریف (definition) کا پہلا حصہ:

آیت ۲ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲﴾ ''حقیقی مؤمن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے' اور وہ اپنے رب ہی پر توکّل کرتے ہیں۔''

آیت ۳ ﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ ''جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اس سے انفاق فی سبیل اللہ مراد ہے۔یعنی وہ لوگ اللہ کے دین کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ ''یہی لوگ ہیں جو حقیقی مؤمن ہیں۔''

یہاں پر ایک مؤمن کی تعریف (definition) کا پہلا حصہ بیان ہوا ہے' جب کہ اس کا دوسرا اور تکمیلی حصہ اس سورت کی آیت ۷۴ میں بیان ہوگا' یعنی آخری سے پہلی (second last) آیت میں۔ اُس آیت میں بھی یہی الفاظ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا﴾ ایک دفعہ پھر آئیں گے۔ ایمان کے ان حقائق کو تقسیم کر کے سورت کے آغاز اور اختتام پر اس طرح رکھا گیا ہے جیسے ساری سورت اس مضمون کی گود میں آ گئی ہو۔

﴿لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴﴾ ''اُن کے لیے ان کے ربّ کے پاس (اونچے) درجات اور مغفرت اور عزت والا رزق ہے۔''

یہاں سے اب غزوۂ بدر کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔

آیت ۵ ﴿كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵﴾ ''جیسے کہ نکالا آپ کو (اے نبی ﷺ) آپ کے رب نے آپ کے گھر سے حق کے ساتھ' اور یقیناً اہل ایمان میں سے کچھ لوگ اسے پسند نہیں کر رہے تھے۔''

یہ اُس پہلی مشاورت کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے مدینہ ہی میں فرمائی تھی۔ لشکر کے میدانِ بدر کی طرف روانگی کو ناپسند کرنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو منافقین تھے جو کسی قسم کی آزمائش میں پڑنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ اپنے منصوبے کے تحت اس طرح کی کسی مہم جوئی کی روایت کو ''Nip the evil in the bud'' کے مصداق ابتدا ہی میں ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ان کے دلائل بظاہر بڑے بھلے تھے کہ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے' ہمیں تو اچھی باتوں اور اچھے اخلاق سے دین کی تبلیغ کرنی چاہیے' اور لڑنے بھڑنے سے بچنا چاہیے' وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف کچھ نیک سرشت سچے مؤمن بھی ایسے تھے جو اپنے خاص مزاج اور سادہ لوحی کے سبب یہ رائے رکھتے تھے کہ ابھی تک قریش کی طرف سے تو کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں ہوا' لہٰذا ہمیں آگے بڑھ کر پہل نہیں کرنی چاہیے۔ زیر نظر آیت میں دوٹوک الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کا بدر کی طرف روانہ ہونا اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھا۔

آیت ۶ ﴿يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ﴾ ''وہ لوگ آپؐ سے جھگڑ رہے تھے حق کے بارے میں' اس کے بعد کہ بات (ان پر) بالکل واضح ہو چکی تھی''

یہ آیت میرے نزدیک دوسری مشاورت کے بارے میں ہے جو مقامِ صفراء پر منعقد ہوئی

تھی۔ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے قریش کے تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کے ارادے سے نکلے تھے' اور یہ بظاہر اسی طرح کی ایک مہم تھی جس طرح کی آٹھ مہمات اس علاقے میں پہلے بھی بھیجی جا چکی تھیں۔ اُس وقت تک لشکرِ قریش کے بارے میں نہ کوئی اطلاع تھی اور نہ ہی ایسا کوئی گمان تھا۔ لیکن جب آپ ﷺ مدینہ سے نکل کر صفراء کے مقام پر پہنچے تو آپؐ کو اپنے ذرائع سے بھی لشکرِ قریش کی مکہ سے روانگی کی اطلاع مل گئی اور اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بھی آپ ﷺ کو اس بارے میں مطلع فرما دیا۔ چنانچہ جس طرح حضرت طالوت نے راستے میں اپنے لشکر کی آزمائش کی تھی کہ دریا کو عبور کرتے ہوئے جو شخص سیر ہو کر پانی پیے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا اور اس طرح مخلص ساتھیوں کا خلوص ظاہر ہو گیا' اسی طرح آپ ﷺ نے بھی اللہ کے حکم سے سارا معاملہ مسلمانوں کے سامنے مشاورت کے لیے رکھ دیا اور ان کو واضح طور پر بتا دیا کہ مکہ سے ابوجہل ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل لشکرِ جرار لے کر روانہ ہو چکا ہے۔

﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶﴾ ''(وہ لوگ ایسے محسوس کر رہے تھے) جیسے انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو اور وہ اسے دیکھ رہے ہوں۔''

ظاہر بات ہے یہ کیفیت تو پکے منافقین ہی کی ہو سکتی تھی۔

آیت ۷ ﴿وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ اللہ وعدہ کر رہا تھا تم لوگوں سے کہ ان دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا''

لشکر یا قافلے میں سے کسی ایک پر مسلمانوں کی فتح کی ضمانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے دی گئی تھی۔

﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) تم یہ چاہتے تھے کہ جو بغیر کانٹے کے ہے وہ تمہارے ہاتھ آئے''

تم لوگوں کی خواہش تھی کہ لشکر اور قافلے میں سے کسی ایک کے مغلوب ہونے کی ضمانت ہے تو پھر غیر مسلح گروہ یعنی قافلے ہی کی طرف جایا جائے' کیونکہ اس میں کوئی خطرہ اور خدشہ (risk) نہیں تھا۔ قافلے کے ساتھ بمشکل پچاس یا سو آدمی تھے جبکہ اس میں پچاس ہزار دینار کی مالیت کے ساز و سامان سے لدے پھندے سینکڑوں اونٹ تھے' لہٰذا اس قافلے پر بڑی آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا اور بظاہر عقل کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں اور سامانِ رسد وغیرہ بھی ناکافی ہے' ہم پوری تیاری کر کے

مدینے سے نکلے ہی نہیں ہیں' لہٰذا یہ بہتر ہوگا کہ پہلے قافلے کی طرف جائیں' اس طرح سازو سامان بھی مل جائے گا' اہل قافلہ کے ہتھیار بھی ہمارے قبضے میں آ جائیں گے اور اس کے بعد لشکر کا مقابلہ ہم بہتر انداز میں کر سکیں گے۔ تو گویا عقل و منطق بھی اسی رائے کے ساتھ تھی۔

﴿وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴾ ''اور اللہ چاہتا تھا کہ اپنے فیصلے کے ذریعے سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔''

یہ وہی بات ہے جو ہم سورۃ الانعام (آیت ۴۵) میں پڑھ آئے ہیں: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ﴾ کہ ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی۔ یعنی اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا۔ یہ سب کچھ دنیا کے عام قواعد و ضوابط (physical laws) کے تحت نہیں ہونے جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس دن کو ''یوم الفرقان'' بنانا چاہتا تھا۔ وہ تین سو تیرہ نہتے افراد کے ہاتھوں کیل کانٹے سے پوری طرح مسلح ایک ہزار جنگجوؤں کے لشکر کو ذلت آمیز شکست دلوا کر دکھانا چاہتا تھا کہ اللہ کی تائید و نصرت کس کے ساتھ ہے اور چاہتا تھا کہ کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے۔

آیت ۸ ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۸﴾ ''تاکہ سچا ثابت کر دے حق کو اور جھوٹا ثابت کر دے باطل کو' خواہ یہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

آیات ۹ تا ۱۹

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُرْدِفِيْنَ ۹ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۱۰ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ
عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ
عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۱۱ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۱۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۱۳ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ

عَذَابَ النَّارِ ۱۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ
الْاَدْبَارَ ۱۵ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ
بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۱۶ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ
بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۱۷ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۱۸ اِنْ
تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۱۹

آیت ۹ ﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۹﴾ ''یاد کرو جبکہ تم لوگ اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے' تو اُس نے تمہاری دُعا قبول کی تھی' کہ میں تمہاری مدد کروں گا ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ جو پے در پے آئیں گے۔''

قریش کے ایک ہزار کے لشکر کے مقابلے میں تمہاری مدد کے لیے ایک ہزار فرشتے آسمانوں سے قطار در قطار اتریں گے۔

آیت ۱۰ ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ﴾ ''اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر (تمہارے لیے) بشارت' اور تاکہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔''

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۱۰﴾ ''اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست' حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ تو ''کُنْ فَیَکُوْن'' کی شان کے ساتھ جو چاہے کر دے۔ وہ فرشتوں کو بھیجے بغیر بھی تمہاری مدد کر سکتا تھا' لیکن انسانی ذہن کا چونکہ سوچنے کا اپنا ایک انداز ہے' اس لیے اُس نے تمہارے دلوں کی تسکین اور تسلی کے لیے نہ صرف ایک ہزار فرشتے بھیجے بلکہ تمہیں ان کی آمد کی اطلاع بھی دے دی کہ خاطر جمع رکھو' ہم تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیج رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اللہ کے وعدے کے مطابق میدانِ بدر میں فرشتے اترے ضرور ہیں لیکن انہوں نے عملی طور پر لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ عملی طور پر جنگ کفار کے ایک ہزار اور مسلمانوں کے تین سو تیرہ افراد کے درمیان ہوئی اور قوت ایمانی سے سرشار مسلمان اس بے جگری اور بے خوفی سے لڑے کہ

ایک ہزار پر غالب آ گئے۔

آیت ۱۱ ﴿اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَکُمْ بِهٖ﴾ ''یاد کرو جبکہ اللہ تمہاری تسکین کے لیے تم پر نیند طاری کر رہا تھا اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس سے تمہیں پاک کرے''

بدر کی رات تمام مسلمان بہت پُرسکون نیند سوئے اور اسی رات غیر معمولی انداز میں بارش بھی ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ پُرسکون نیند اور بارش کا نزول گویا دو معجزے تھے' جن کا ظہور مسلمانوں کی خاص مدد کے لیے عمل میں آیا۔ یہ معجزات اس انداز میں ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے باقاعدہ ان کے بارے میں اعلان فرمایا ہو' یا یہ کہ یہ بالکل خرقِ عادت واقعات ہوں' بلکہ یہ معجزات اس انداز میں تھے کہ اس وقت ان دونوں واقعات سے مسلمانوں کو غیر معمولی طور پر مدد ملی' اور اس لیے بھی کہ ایسی چیزیں محض اتفاقات سے ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔ حقیقت میں غزوۂ بدر کا یہ معاملہ مسلمانوں کے لیے بہت سخت تھا' جس کی وجہ سے ہر شخص کے لیے بظاہر فکرمندی' تشویش اور اندیشہ ہائے دور دراز کی انتہا ہونی چاہیے تھی' کہ کل جو کچھ ہونے جا رہا ہے اس میں میں زندہ بھی بچ پاؤں گا یا نہیں؟ مگر عملی طور پر یہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ مسلمان رات کو آرام وسکون کی نیند سوئے اور صبح بالکل تازہ دم اور چاق وچوبند ہو کر اٹھے۔ اسی طرح اس رات جو بارش ہوئی وہ بھی مسلمانوں کے لیے اللہ کی تائید ونصرت ثابت ہوئی۔ اس بارش سے دوسرے فوائد کے علاوہ مسلمانوں کو ایک یہ سہولت بھی میسر آ گئی کہ جن لوگوں کو غسل کی حاجت تھی انہیں غسل کا موقع مل گیا۔

﴿وَیُذْهِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ وَیُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ⑪﴾ ''اور تاکہ دُور کر دے تم سے شیطان کی (ڈالی ہوئی) نجاست کو اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے پاؤں جما دے۔''

اس بارش میں مسلمانوں کے لیے اطمینانِ قلوب کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہیں اس خشک صحرا کے اندر پانی کا وافر ذخیرہ مل گیا' ورنہ لشکر قریش پہلے آ کر پانی کے تالاب پر قبضہ کر چکا تھا اور مسلمان اس سے محروم ہو چکے تھے۔ بارش ہوئی تو نشیب کی بنا پر سارا پانی مسلمانوں کی طرف جمع ہو گیا' جسے انہوں نے بند وغیرہ باندھ کر ذخیرہ کر لیا۔ بارش کی وجہ سے مٹی دب گئی' ریت فرش کی طرح ہو گئی اور چلنے پھرنے میں سہولت ہو گئی۔

آیت ۱۲ ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یاد کریں جب آپؐ کا ربّ وحی کر رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' تو تم (جاؤ اور) اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو۔''

وہی ایک ہزار فرشتے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے' انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ رہنے کی ہدایت کا تذکرہ ہے۔

﴿سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ ⑫﴾ ''میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس مارو ان کی گردنوں کے اوپر اور مارو ان کی ایک ایک پور پر۔''

اللہ تعالیٰ نے کفار کو بھرپور مقابلے کے دوران دہشت زدہ کر دیا تھا اور جب کوئی شخص اپنے حریف کے مقابلے میں دہشت زدہ ہو جائے تو اس کے اندر قوتِ مدافعت نہیں رہتی۔ پھر وہ گویا حملہ آور کے رحم وکرم پر ہوتا ہے' وہ جدھر سے چاہے اُسے چوٹ لگائے' جدھر سے چاہے اُسے مارے۔

آیت ۱۳ ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ⑬﴾ ''اور یہ (سزا ان کی) اس لیے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ اور اس کے رسولؐ کی' اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کرے تو اللہ بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اس کے بعد اب قریش سے براہِ راست خطاب ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْهُ﴾ ''(لو) یہ تو چکھو''

ابھی ہماری طرف سے سزا کی پہلی قسط وصول کرو۔

﴿وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ ⑭﴾ ''اور یہ (بھی تمہیں معلوم رہے) کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔''

یعنی یہ مت سمجھنا کہ تمہاری یہی سزا ہے' بلکہ اصل سزا تو جہنم ہو گی' اس کے لیے بھی تیار رہو۔

آیت ۱۵ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا﴾ ''اے اہلِ ایمان'

جب تمہارا مقابلہ ہو جائے کافروں سے میدانِ جنگ میں‘‘

’’زحف‘‘ میں باقاعدہ دو لشکروں کے ایک دوسرے کے مدِّمقابل آ کر لڑنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ غزوۂ بدر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے علاقے میں آٹھ مہمات (expeditions) بھیجی گئی تھیں‘ مگر ان میں سے کوئی مہم بھی باقاعدہ جنگ کی شکل میں نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ انہیں چھاپہ مار مہمات کہا جا سکتا ہے‘ لیکن بدر میں مسلمانوں کی کفار کے ساتھ پہلی مرتبہ دو بدو جنگ ہوئی ہے۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال کے لیے ہدایات دی جا رہی ہیں کہ جب میدان میں باقاعدہ جنگ کے لیے تم لوگ کفار کے مقابل آ جاؤ:

﴿فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝۱۵﴾ ’’تو تم ان سے پیٹھ مت پھیرنا۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ ڈٹے رہو‘ مقابلہ کرو۔ جان چلی جائے لیکن قدم پیچھے نہ ہٹیں۔

آیت ۱۶ ﴿ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ ﴾ ’’اور جو کوئی بھی اُن سے اُس دن اپنی پیٹھ پھیرے گا‘‘

یعنی اگر کوئی مسلمان میدانِ جنگ سے جان بچانے کے لیے بھاگے گا۔

﴿اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ﴾ ’’سوائے اس کے کہ وہ کوئی داؤ لگا رہا ہو جنگ کے لیے‘‘

جیسے دو آدمی دو بدو مقابلہ کر رہے ہوں اور لڑتے لڑتے کوئی دائیں‘ بائیں یا پیچھے کو ہٹے‘ بہتر داؤ کے لیے پینترا بدلے تو یہ بھاگنا نہیں ہے‘ بلکہ یہ تو ایک تدبیراتی حرکت (tactical move) شمار ہوگی۔ اسی طرح جنگی حکمتِ عملی کے تحت کمانڈر کے حکم سے کوئی دستہ کسی جگہ سے پیچھے ہٹ جائے اور کوئی دوسرا دستہ اُس کی جگہ لے لے تو یہ بھی پسپائی کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

﴿اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ ’’یا کسی (دوسری) جمعیت سے ملنا ہو‘‘

یعنی لڑائی کے دوران اپنے لشکر کے کسی دوسرے حصے سے ملنے کے لیے منظّم طریقے سے پیچھے ہٹنا (orderly retreat) بھی پیٹھ پھیرنے کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ ان دو استثنائی صورتوں کے علاوہ اگر کسی نے بزدلی دکھائی اور بھگدڑ کے اندر جان بچا کر بھاگا:

﴿فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶﴾ ’’تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے‘ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔‘‘

اب اگلی آیات میں یہ بات واضح تر انداز میں سامنے آ رہی ہے کہ غزوۂ بدر دُنیوی قواعد و

ضوابط کے مطابق نہیں‘ بلکہ اللہ کی خاص مشیت کے تحت وقوع پذیر ہوا تھا۔

آیت ۱۷ ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠﴾ ’’پس (اے مسلمانو!) تم نے انہیں قتل نہیں کیا‘ بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا‘‘

ویسے تو ہر کام میں فاعل حقیقی اللہ ہی ہے‘ ہم جو کام بھی کرتے ہیں وہ اللہ ہی کی مشیت سے ممکن ہوتا ہے‘ اور جس شے کے اندر جو بھی تاثیر ہے وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ عام حالات کے لیے بھی اگرچہ یہی قاعدہ ہے: **لَا فَاعِلَ فِي الْحَقِيْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ**‘‘ لیکن یہ تو مخصوص حالات تھے جن میں اللہ کی خصوصی مدد آئی تھی۔

﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ ’’اور جب آپؐ نے (ان پر کنکریاں) پھینکی تھیں تو وہ آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں‘‘

میدانِ جنگ میں جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے کچھ کنکریاں اپنی مٹھی میں لیں اور **شَاهَتِ الْوُجُوْه** (چہرے بگڑ جائیں) فرماتے ہوئے کفار کی طرف پھینکیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کنکریاں کہاں کہاں تک پہنچی ہوں گی اور اُن کے کیسے کیسے اثرات کفار پر مرتب ہوئے ہوں گے۔ بہرحال یہاں پر آپ ﷺ کے اس عمل کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کر رہا ہے کہ اے نبی (ﷺ) جب وہ کنکریاں آپ نے پھینکی تھیں‘ تو وہ آپ ﷺ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ اسی بات کو اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ع ’’ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!‘‘

﴿وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ﴾ ’’تاکہ اللہ اس سے اہل ایمان کے جوہر نکھارے خوب اچھی طرح سے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی آزمائشیں اپنے بندوں کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ بَلَا‘ یَبْلُو‘ بَلَاءً کے معنی ہیں آزمانا‘ تکلیف اور آزمائش میں ڈال کر کسی کو پرکھنا‘ لیکن اَبْلٰی‘ یُبْلِی جب بابِ افعال سے آتا ہے تو کسی کے جوہر نکھارنے کے معنی دیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۷﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۸﴾ ’’یہ تو ہو چکا‘ اور (آئندہ کے لیے بھی سمجھ لو کہ) اللہ کفار کی تمام چالوں کو ناکام بنا دینے والا ہے۔‘‘

یہ گویا اہلِ ایمان اور کفار دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد صرف کُفّار

سے خطاب ہے۔ ابوجہل کو بحیثیت سپہ سالار اپنے لشکر کی تعداد' اسلحہ اور ساز و سامان کی فراوانی کے حوالے سے پورا یقین تھا کہ ہم مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے ہی پراپیگنڈا شروع کر دیا تھا کہ معرکہ کا دن ''یوم الفرقان'' ثابت ہوگا اور اُس دن یہ واضح ہو جائے گا کہ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اللہ کو تو کفار بھی مانتے تھے۔ چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں ابوجہل کی اس دعا کے الفاظ بھی منقول ہیں جو بدر کی رات اس نے خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ سے مانگی تھی۔ اُس رات جب ایک طرف حضور اکرم ﷺ دعا مانگ رہے تھے تو دوسری طرف ابوجہل بھی دعا مانگ رہا تھا۔ اس کی دُعا حیرت انگیز حد تک موحدانہ ہے۔ اس دعا میں لات' منات' عزیٰ اور ہُبل وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں' بلکہ اس دُعا میں وہ براہِ راست اللہ سے التجا کر رہا ہے: **اللّٰھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ** کہ اے اللہ جس شخص نے ہمارے رحمی رشتے کاٹ دیے ہیں' کل تو اسے کچل کر رکھ دے۔ اس دُعا سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ابوجہل کا حضور ﷺ پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ آپ ﷺ کی وجہ سے قریش کے خون کے رشتے کٹ گئے تھے۔ مثلاً ایک بھائی مسلمان ہو گیا ہے اور باقی کافر ہیں' تو نہ صرف یہ کہ ان میں اخوت کا رشتہ باقی نہ رہا' بلکہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اسی طرح اولاد ماں باپ سے اور بیویاں اپنے شوہروں سے کٹ گئیں۔ چونکہ اس عمل سے قریش کی یک جہتی' طاقت اور ساکھ بری طرح متاثر ہوئی تھی' اس لیے سب سے زیادہ انہیں اسی بات کا قلق تھا۔ بہرحال ابوجہل سمیت تمام قریش کی خواہش تھی اور وہ دعا گو تھے کہ اس چپقلش کا واضح فیصلہ سامنے آجائے۔ ان کی اسی خواہش اور دعا کا جواب یہاں دیا جا رہا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ﴾ ''اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو تمہارے پاس (اللہ کا) فیصلہ آ چکا۔''

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کن فتح کے ذریعے بتا دیا کہ اُس کی تائید و نصرت کس گروہ کے ساتھ ہے۔ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح ہو گیا۔

﴿وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ﴾ ''اور اگر اب بھی تم باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے' اور اگر تم پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کچھ دوبارہ کریں گے۔''

﴿وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۹﴾ ''اور تمہاری یہ جمعیت تمہارے کسی کام نہیں آ سکے گی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو' اور یہ کہ اللہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہے۔'' ❁❁

ارکانِ اسلام

بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کا ۲۷ جولائی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

بانیٔ تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ۰۸-۲۰۰۷ء کے دوران اپنے خطاباتِ جمعہ میں امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعین نوویؒ'' کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا تھا۔ اس سلسلہ کے ابتدائی خطابات ترتیب وتسوید کے بعد میثاق (جنوری تا ستمبر ۲۰۰۸ء) میں شائع کیے گئے تھے' جن میں سے چار خطابات کو ''اسلام' ایمان اور احسان: حدیث جبریلؑ کی روشنی میں'' کے عنوان سے کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس شمارے سے بانیٔ محترم کا یہ سلسلۂ خطابات ''میثاق'' میں دوبارہ شروع کیا جا رہا ہے۔ پیش نظر خطاب ''اربعین نوویؒ'' کی تیسری حدیث کے مطالعہ پر مشتمل ہے' جس کی ترتیب وتسوید کی سعادت ہمارے شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد نے حاصل کی ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ ۝ (البینۃ)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہما قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام ودعائمہ العظام۔

ابوعبدالرحمٰن' سیدنا عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

معزز سامعین کرام!

آج جو حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے' جس کا متن اور اردو ترجمہ میں نے آپ کے سامنے بیان کیا' یہ متفق علیہ ہے' یعنی اس کی صحت پر امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ دونوں کا اتفاق ہے اور ایسی حدیث مجموعۂ احادیث میں سب سے زیادہ مستند اور صحت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہے —— ہمارے ہاں کتب احادیث کے حوالے سے ''صحاحِ ستّہ'' کی اصطلاح بہت معروف ہے' یعنی چھ ایسے مجموعہ ہائے احادیث (صحیح البخاری' صحیح مسلم' سنن الترمذی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ اور سنن النسائی) جو صحیح احادیث پر مشتمل ہیں —— اِن صحاحِ ستّہ میں بھی بخاری و مسلم کا درجہ سب سے بلند ہے اور ان دونوں کو ''صحیحین'' بھی کہا جاتا ہے۔ پھر وہ حدیث جس پر امام بخاری و مسلم دونوں متفق ہو جائیں تو وہ روایت اور سند کے اعتبار سے قرآنِ کریم کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ گویا وہ قرآن کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہے اور اس پر ہم اتنا یقین کر سکتے ہیں جتنا قرآنی آیات پر کرتے ہیں۔

زیر مطالعہ حدیث کا مضمون بعینہٖ وہ ہے جو حدیثِ جبریلؑ میں بیان ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حدیثِ جبریل ''اُمُّ السُّنّۃ'' کہلاتی ہے۔ یعنی احادیث کے مجموعے میں اس کا وہی مقام ہے جو قرآن مجید میں سورۃ الفاتحہ کا ہے۔ سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے جب آپ ﷺ سے سوال کیا: ((اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ)) یعنی مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے (کہ اسلام کیا ہے؟) تو اس کے جواب میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، وَتُقِیْمَ الصَّلَاۃَ، وَتُؤْتِیَ الزَّکَاۃَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ

اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا))

''اسلام یہ ہے کہ تُو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور تُو نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو۔''

ارکانِ اسلام' کُل اسلام نہیں

ان دو احادیث کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حدیثِ جبریل میں یہ مضمون حدیث کا ایک جزو ہے جبکہ یہ مکمل (independent) حدیث ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے مشمولات (contents) کا تعلق ہے ان پر حدیثِ جبریل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے' البتہ زیرِ مطالعہ حدیث کا آغاز جس جملے سے ہو رہا ہے: ''بُنِیَ الۡاِسۡلَامُ عَلٰی خَمۡسٍ'' (اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے) وہ انتہائی اہم اور غور طلب ہے۔ اس حدیث مبارکہ (جس میں ارکانِ اسلام کو بیان کیا گیا ہے) کے بارے میں لوگوں کو ایک غلط فہمی اور مغالطہ ہوا ہے کہ انہوں نے ارکانِ اسلام ہی کو اسلام کی مکمل تعبیر سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا پہلا جملہ ہی اس تصور کی نفی کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اسلام کی بنیاد ان چیزوں پر ہے۔ اب یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ بنیاد اور شے ہے اور عمارت اور شے۔ لہٰذا یہ ارکانِ اسلام ہیں مکمل اسلام نہیں' جبکہ آج انہی ارکانِ خمسہ کو کُل کا کُل اسلام قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تصور سے ایک بہت بڑی حقیقت نظر انداز ہو جاتی ہے اور یہ عام مغالطہ ہے جو لوگوں کو اس حدیث کے حوالے سے ہوا ہے۔

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور اکثر مساجد میں کبھی اس حدیث کے حوالے سے بڑے بڑے چارٹ لٹکے ہوئے ہوتے تھے' جس میں ایک مسجد کی محراب کی سی شکل بنا کر اور اس میں پانچ ستون دکھا کر ارکانِ اسلام کا ایک نقشہ پیش کیا جاتا تھا۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد: عبادتِ ربّ

قرآن مجید میں تخلیقِ انسانی کا مقصد عبادتِ ربّ قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جنّوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر صرف اس لیے کہ میری بندگی اور پرستش کریں۔''

لہٰذا مقصدِ تخلیقِ انسانیت عبادتِ الٰہی ہے اور جمیع انبیاء کرام علیہم السلام اسی کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ الغرض تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت ''عبادتِ ربّ'' کی دعوت تھی: ﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ﴾ (ھود: ۵۰) ''اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں''۔ تمام انبیاء کرام کی طرح نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت بھی ''عبادتِ ربّ'' ہی کی دعوت تھی: ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا' تاکہ تم بچ سکو''۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور سابقہ رسولوں کی دعوت میں ایک بنیادی فرق ہے کہ سابقہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کا صیغۂ خطاب ''یٰقَوۡمِ'' (اے میری قوم کے لوگو!) ہوتا تھا' اس لیے کہ وہ کسی خاص علاقے اور کسی خاص قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے تھے' جبکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی دعوت کا صیغۂ خطاب تھا: ''یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) اس لیے کہ آپ ﷺ کی دعوت عالمگیر اور آفاقی ہے' یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے — اس فرق کے باوجود سابقہ تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام اور نبی آخر الزماں ﷺ کی دعوت ایک ہی ہے' یعنی عبادتِ ربّ کی دعوت۔

عبادت کا جامع مفہوم

اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''عبادت'' کا مفہوم کیا ہے۔ لفظ عبادت عبد سے نکلا ہے' عبد غلام کو کہتے ہیں اور غلام آقا کی ملکیت ہوتا ہے' صرف ملازم نہیں ہوتا۔ ملازم تو چند گھنٹوں یا کسی خاص ڈیوٹی کے لیے ہوتا ہے اور اس کام کو کرنے کے بعد وہ آزاد ہے' جو چاہے کرے' جہاں چاہے جائے۔ مثلاً کسی کو آپ نے اپنا ڈرائیور رکھا ہے تو وہ آپ کا کھانا تو نہیں پکائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو آپ نے خانساماں رکھا ہے تو وہ آپ کا

ٹائلٹ صاف نہیں کرے گا۔ اگر آپ اسے کہیں گے بھی تو وہ صاف کہے گا کہ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے‘ میں اس کام کے لیے آپ کا ملازم نہیں ہوں۔ جبکہ غلام کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی۔ غلام کو ہمہ تن‘ ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ اپنے آقا کی اطاعت کرنا ہوتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور نہ اس کی کوئی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ کسی چیز کا مالک کیا بنے گا وہ تو خود مملوک ہے۔ آقا اسے جہاں سونے کو کہے گا‘ وہاں سونا ہوگا اور جہاں اور جس وقت جانے کو کہے گا جانا ہوگا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہے نہ پروگرام اور نہ ہی کوئی لائحہ عمل‘ بلکہ وہ تو آقا کے اشارۂ ابرو پر چلے گا۔ یہ ہے عبادت کا مفہوم‘ کہ اللہ (جو ہمارا آقا ہے) کی اطاعت میں عبدیت (غلامی) کا تصور ہر وقت ذہن میں نقش رہے۔ اسی کو فارسی میں بندگی کہا جاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی　　زندگی بے بندگی شرمندگی!

یعنی ہمیں زندگی فقط بندگی کے لیے ملی ہے‘ اگر بندگی نہیں کریں گے تو یہ شرمندگی ہی شرمندگی ہوگی — پچھلے زمانے میں ایسے اشعار بھی مساجد میں لکھے ہوتے تھے۔

یہاں غلامی اور عبادت کا فرق بھی ذہن نشین رہے کہ غلام جو آقا کی اطاعت کر رہا ہے وہ مجبوری سے کر رہا ہے‘ کیونکہ اس نے اُسے خرید رکھا ہے‘ وہ اس کا مالک ہے اور اس نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔ لیکن سمجھ لیجیے کہ یہ بھی عبادت نہیں ہے۔ عبادت میں کرنا تو وہی ہے جو ربّ تعالیٰ کی منشا ہے‘ لیکن مجبور ہو کر نہیں بلکہ محبت الٰہی کے جذبۂ مستانہ سے سرشار ہو کر اپنی جبین نیاز کو بارگاہِ الٰہی میں اس ادا سے رکھنا کہ جسم ظاہری کے روئیں روئیں سے **انا عبدك ‘ انا عبدك** کی صدائے حق بلند ہو۔ اسی لیے میں نے عبادت کے مفہوم میں بندگی کے ساتھ ’’پرستش‘‘ کا لفظ بھی شامل کیا تھا‘ اس لیے کہ پرستش ہوتی ہی محبت کے ساتھ ہے۔ مثلاً اگر آپ دولت کے پرستار ہیں تو آپ کے دل میں دولت کی محبت ہے‘ وطن پرست ہیں‘ قوم پرست ہیں‘ نفس پرست ہیں تو یقیناً ان کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے۔ لہٰذا جب بندگی اس جذبۂ اُلفت میں ڈوب کر کی جائے گی تو وہ عبادت کا مقام حاصل کرے گی۔

ایک بات سمجھ لیجیے کہ ہماری عبادت کا اس مقام و مرتبہ تک پہنچنا انتہائی مشکل کام ہے‘ لہٰذا اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ آپ طے کر لیں کہ مجھے چلنا اسی راستے پر ہے۔ پھر اس راہ میں نشیب و فراز آئیں گے‘ کہیں قدم ڈگمگائیں گے‘ کہیں جذبات کا غلبہ ہوگا‘ کبھی ناامیدی ہی ناامیدی چھائے گی اور کسی جگہ اُمید کی کرن نظر آئے گی‘ مگر آپ کو بندگی اور پرستش کے راستے پر مسلسل چلتے رہنا ہے۔ اگر کہیں قدم پھسل گیا تو وہیں کیچڑ میں پڑے نہیں رہنا‘ کبھی بھی کسی گناہ پر مصر نہیں ہونا اور ڈیرہ ڈال کر نہیں بیٹھنا۔ جب بھی کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے بخشوانا ہے‘ ورنہ ایک ہی گناہ تباہی اور ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ یہ ہے عبادت کا جامع مفہوم!

ارکانِ اسلام کی اہمیت

(۱) اقامتِ صلوٰۃ: عبادت کے اس اعلیٰ مرتبہ کو آسانی سے پانے اور اللہ کی بندگی اور پرستش کے جذبہ کو تازہ رکھنے کے لیے چار عبادات فرض کر دی گئی ہیں جن کا ذکر زیر مطالعہ حدیث میں ہوا ہے۔ یہ چاروں اسلام کے ارکان اور اسلام کی عمارت کے چار ستون ہیں۔ ان میں سب سے مقدم اور اہم نماز ہے۔ نماز کو دن میں پانچ مرتبہ فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے مقصدِ تخلیق ’’عبادتِ رب‘‘ کو نہ بھولے۔ اس لیے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس سورۃ کی سات آیات (انہیں ’’سبع مثانی‘‘ یعنی بار بار پڑھی جانے والی آیات بھی کہا جاتا ہے) میں مرکزی اور چوٹی کی آیت چوتھی ہے: ﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴ ﴾ چونکہ اس آیت میں ’’نَعْبُدُ‘‘ اور ’’نَسْتَعِیْنُ‘‘ فعل مضارع کے صیغے ہیں اور عربی زبان میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کو cover کرتا ہے‘ اس لیے اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: ’’اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے‘ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے‘‘۔ یہ قول و قرار دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جائے۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

تو انہی نقوشِ بندگی کو تازہ رکھنے کے لیے اوّلین اور اہم ترین ذریعہ نماز ہے۔

(۲) صیامِ رمضان: دوسرے یہ کہ آپ کے ساتھ نفسِ حیوانی لگا ہوا ہے‘ جس کے تقاضے بھی حیوانی ہیں۔ان تقاضوں میں سے سب سے اہم دو چیزیں ہیں: (۱) خوراک (۲) جنسی جذبۂ شہوت۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک ضروری ہے‘ ورنہ مر جائیں گے‘ اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جذبہ شہوت یعنی شادی بیاہ ضروری ہے‘ ورنہ نسل ختم ہو جائے گی۔لیکن یہ دونوں حیوانی داعیے (animal instincts) اتنے طاقتور ہیں کہ جب اندر سے اُبھرتے ہیں تو اندھے بہرے ہوتے ہیں۔انہیں صرف اس سے غرض ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کی تسکین ہونی چاہیے۔بھوک لگتی ہے تو پیٹ کچھ کھانے کو مانگتا ہے۔اسے اس سے غرض نہیں کہ جو چیز اس میں ڈالی جا رہی ہے وہ حلال ہے یا حرام‘ بس اس کی تو بھوک مٹنی چاہیے۔اسی طرح جب جذبۂ شہوت بھڑک اٹھے تو وہ اپنی تسکین چاہتا ہے‘ جائز راستے سے ہو یا ناجائز راستے سے۔

یوں سمجھئے کہ ہمارا یہ حیوانی وجود گھوڑے کی مانند ہے اور ہمارا روحانی وجود یعنی وجودِ حقیقی اس پر سوار ہے۔اگر گھوڑا منہ زور ہے اور سوار کمزور ہے تو سوار گھوڑے کے رحم وکرم پر ہے‘ وہ جہاں چاہے اُسے پٹخ دے گا‘ جس کھائی میں چاہے اسے گرا دے گا۔چنانچہ اس پر سواری کے لیے ضروری ہے کہ اس روحانی وجود کو طاقتور بنایا جائے‘ اس کی خودی اور انا کو مضبوط کیا جائے تاکہ یہ بھوک اور شہوت کی شدت کو برداشت کر سکے۔اس مقصد کے حصول کے لیے روزہ فرض کر دیا گیا کہ سارا دن بھوکے اور پیاسے رہو‘ چاہے سخت گرمی ہی کیوں نہ ہو۔طلوعِ فجر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے کی ہر جائز چیز بھی آپ پر حرام ہے۔اپنی منکوحہ بیوی سے بھی روزہ کی حالت میں تعلق قائم کرنا حرام ہے۔اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے اس عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے‘ یعنی بچ بچ کر چلتے

رہو اور حیوانی وجود پر مکمل کنٹرول حاصل کرو‘ اسے آزاد مت چھوڑو!

(۳) ایتائے زکوٰۃ: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸﴾ (العٰدیٰت) ’’بلاشبہ وہ (انسان) مال کی محبت میں بہت سخت ہے‘‘۔دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے سامانِ زندگی تو ضرور چاہیے اور یہ پیسے سے حاصل ہوتا ہے‘ لہٰذا کسی حد تک اس کی ضرورت ہے‘ لیکن انسان اس سے بہت آگے بڑھ کر دولت پرست اور مال کا پجاری بن جاتا ہے۔انسان اس کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے اور حلال وحرام کی پروا کیے بغیر صبح وشام مال جمع کرنے کی فکر میں رہتا ہے‘ بلکہ اس کے لیے ظلم اور غصب کا راستہ اختیار کرنے سے بھی نہیں کتراتا۔اس طرزِ عمل سے روکنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا کہ دوسروں کو اللہ کے لیے دیتے رہنے کی عادت ڈالو‘ زیادہ سے زیادہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ لوگ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہی کافی سمجھتے ہیں‘ حالانکہ حدیث میں ہے:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)) (۱)

’’تمہارے مال میں (غریبوں کے لیے) زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔‘‘

اس کو فقہی اصطلاح میں ’’صدقاتِ نافلہ‘‘ کہتے ہیں۔زکوٰۃ چونکہ فرض ہے اس لیے وہ تو علی الاعلان دی جائے گی‘ جبکہ صدقاتِ نافلہ راز داری اور خفیہ طریقے سے دیے جائیں گے۔ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہ ہو‘ اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے۔اسلامی ریاست میں اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ حکومت وصول کرتی ہے اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ہر ایک کو انفرادی طور پر ادا کرنی ہوتی ہے۔

(۴) حج بیت اللہ: ارکانِ اسلام میں آخری رکن حج ہے‘ اس میں مذکورہ تینوں عبادات کی حکمتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ذکر الٰہی بھی ہے کہ بآوازِ بلند تلبیہ پڑھا جاتا ہے‘ طواف کے دوران بھی اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے‘ پھر شعائر اللہ کی زیارت ہے‘ بیت اللہ کو صرف دیکھنا بھی باعث اجر وثواب ہے۔اسی طرح احرام میں روزے جیسی کچھ پابندیاں عائد کی گئی

(۱) سنن الترمذی: ابواب الزکوۃ‘ باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ

ہیں کہ چاہے بیوی ساتھ ہے پھر بھی تعلّقِ زن وشو قائم نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کہ مال بھی خرچ ہوتا ہے‘ حج کے لیے ایک خطیر رقم درکار ہوتی ہے۔ گویا تمام عبادات میں جامع ترین عبادت حج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا حج اللہ کے ہاں قبول ہو جائے وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے جس طرح آج ہی اس کی ماں نے اسے جنا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حج کے مذکورہ فوائد تبھی حاصل ہوں گے جب وہ حج حلال کمائی سے کیا گیا ہو حرام سے نہیں‘ وہاں احرام کی ساری پابندیوں کا لحاظ رکھا ہو اور حج کے سارے اعمال بڑی عمدگی اور اعلیٰ اسلوب کے ساتھ ادا کیے ہوں۔ اس کے ساتھ حج کے دوران کوئی بے حیائی اور گناہ کا کام بھی نہ کیا ہو‘ جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۹۷)

’’حج کے مہینے معروف ہیں۔ تو جس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ان مہینوں میں حج کو تو (اس کو خبردار رہنا چاہیے کہ) دورانِ حج نہ تو شہوت کی کوئی بات کرے‘ نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ)) (۱)

’’جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور اس میں بے حیائی کی بات نہ بولے اور گناہ کا کام نہ کرے تو وہ لوٹ کر آتا ہے (اور گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے) گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔‘‘

بندگیٔ ربّ‘ خطا اور توبہ

یہ ارکانِ خمسہ بنیاد ہیں اور اس بنیاد پر استوار ہونے والی عمارت اسلام ہے‘ جس کا ماقبل تفصیل سے تذکرہ ہوا ہے‘ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمہ وقت‘ ہمہ تن‘ ہمہ جہت اللہ کی اطاعت‘ محبت کے انتہائی جذبے سے سرشار ہوکر کی جائے۔ ہاں کبھی غلطی ہوسکتی ہے‘ خطا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب فضل الحج المبرور۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الحج‘ باب فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفۃ۔ واللفظ للبخاری۔

ہوسکتی ہے تو خالص توبہ کرو‘ اللہ معاف کردے گا — خالص توبہ کی تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ‘ توبہ نہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ انسان اس فعل کو عملاً چھوڑ کر عملِ صالح کی روش اختیار کرے۔ دوسری یہ کہ دل میں پکا ارادہ کرلے کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ تیسری اور لازمی شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے کیے پر حقیقی پچھتاوا اور شرمندگی ہو کہ میں یہ کیا کر بیٹھا ہوں‘ یہ مجھ سے کیا ہوگیا ہے۔ توبہ کی اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان کے دل میں اپنی غلطی پر ندامت پیدا ہوجائے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب میں ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا اور اس پر داد دی کہ میاں اس عمر میں یہ شعر! ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

انفعال کہتے ہیں پشیمانی اور شرمندگی کو۔ عام طور پر جب کسی انسان پر پشیمانی اور شرمندگی طاری ہوتی ہے تو پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔ علامہ اقبال ان قطروں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ان قطروں کی اتنی وقعت ہے کہ اللہ نے ان کو موتیوں کی طرح چُن لیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر خطاکار ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۱)

’’تمام بنی آدم بہت خطاکار ہیں‘ لیکن ان خطاکاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔‘‘

یعنی اگر وقتی جذبات سے مغلوب ہوکر یا کسی جذباتی سیلاب کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات کی وجہ سے آپ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے تو فوراً واپس لوٹیں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کریں تو اللہ یقیناً معاف فرمادے گا۔ سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرمادیا گیا کہ

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الزھد‘ باب ذکر التوبۃ۔ وسنن الترمذی‘ کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (النساء:۱۷)

''اللہ کے ذمّے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو جہالت اور نادانی میں کوئی غلط حرکت کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں' پس یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

کلمۂ شہادت' اسلام میں داخلے کی بنیاد

اس حدیث میں جو ارکانِ خمسہ بیان ہوئے ہیں ان میں پہلا رکن کلمۂ شہادت اسلام میں داخلے کی بنیاد ہے' جبکہ باقی ارکانِ اربعہ (نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج) جو اسلام کے ارکان اور چوٹی کے اعمال ہیں' ان پر عمل نہ کرنے کی بنیاد پر کوئی شخص کافر قرار نہیں پائے گا' البتہ ان میں سے کسی کے انکار پر کافر ہو جائے گا — مختلف فقہاء کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کو تعزیر کے طور پر جسمانی سزا دی جائے گی' اسے قید کیا جائے گا اور اسے توبہ پر مجبور کیا جائے گا۔ بعض فقہاء کا موقف ہے کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے' اس لیے کہ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(۱)

''بندے اور کفر و شرک کے مابین نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لیکن یہ قتل کرنا بھی تعزیراً ہو گا' اُسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔ جیسے شادی شدہ زانی پر حد جاری کر کے اسے رجم کے ذریعے قتل تو کیا جائے گا' لیکن اسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔

دراصل اسلام میں داخل ہونے یا شامل رہنے کے لیے بنیاد صرف ایک چیز بنتی ہے اور وہ کلمۂ شہادت ہے۔ چنانچہ کوئی شخص ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگرچہ قرائن موجود ہوں اور حالات یہ گواہی دے رہے ہوں کہ اُس نے دل سے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔ ترمذی کی روایت میں الفاظ ہیں: ((بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْاِيْمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))

کلمہ نہیں پڑھا تب بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

ایک جنگ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ایک ایسے ہی شخص کی جان لے لی تھی۔ حضرت اسامہؓ کی کفار کے لشکر میں سے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ شخص حضرت اسامہؓ کی تلوار کی زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے' لہٰذا اس پر تلوار چلا دی اور سر قلم کر دیا۔ بعد میں اُسامہؓ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوئے تو آپؐ نے انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اسامہ! اُس وقت تم کیا کرو گے جب قیامت کے دن یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف گواہی دینے کے لیے آئے گا!''

قرآن کریم میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے اسلام کا اظہار کرے تو اسے یہ مت کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو! سورۃ النساء کی آیت ۹۴ میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾

''اے اہلِ ایمان! جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور کسی ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے سلامتی پیش کرے (تمہیں سلام کہے یا اپنا اسلام پیش کرے) یہ نہ کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو۔''

یہ بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیثِ جبریل سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اِن کی روایت میں ہے کہ جب جبرائیلؑ نے کہا: حَدِّثْنِيْ بِالْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْهَكَ لِلّٰهِ)) ''اسلام یہ ہے کہ تو اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (سرِ تسلیم خم کر دے)۔'' یہ لفظ اسلام کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتا ہے' اس لیے کہ اسلام کے لغوی معنی ہی اطاعت قبول کر لینا (to surrender) ہے۔

''عباداتِ اربعہ'' میں سے دو چیزوں (نماز اور زکوٰۃ) کا ذکر سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں بھی آیا ہے۔ اس اعلانِ عام کے بعد کہ مشرکینِ عرب کو صرف چار مہینوں کی مہلت ہے' ارشاد ہوا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (التوبۃ)

''جب عزت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو' اور ان کو پکڑ لو اور گھیر لو' اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

عبادت اور عبادات میں فرق

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخلے کی بنیاد کلمہ شہادت ہے اور اس کا عملی اظہار ''عباداتِ اربعہ'' سے ہوگا اور ان کی حقیقت اور روح ''عبادتِ رب'' ہے۔

''عبادت'' اور ''عبادات'' کا فرق سورۃ البینہ کی اس آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے جو خطاب کے شروع میں تلاوت کی گئی:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البینۃ)

''اور انہیں نہیں حکم ہوا تھا مگر اس بات کا کہ اللہ کی یکسو ہو کر عبادت کریں اسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اور یہی ہے ہمیشہ کا قائم دین۔''

یعنی دین ان چیزوں پر قائم ہے۔ اس آیت میں عبادت' نماز' زکوٰۃ تینوں کے درمیان ''واؤ'' آ رہی ہے۔ عربی گرامر میں اس کو واوِ عطف کہتے ہیں اور عطف دو چیزوں کے درمیان مغائرت ثابت کرتا ہے' یعنی پہلی چیز اور ہے دوسری اور ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں: ''قلم و پینسل''۔ اس مرکب میں قلم اور شے ہے اور پینسل اور شے۔ اسی طرح محولہ بالا آیت میں عبادت اور شے ہے' نماز و زکوٰۃ اور چیزیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اصل عبادت کچھ اور ہے اور یہ عبادات (ارکانِ اسلام) اس کو سہارا (support) دینے کے لیے ہیں۔ اگر آپ نے صرف ستون کھڑے کر لیے اور ان کے اوپر چھت ہی

نہیں ڈالی تو ان ستونوں کا فائدہ؟ آج ہمارے ذہنوں سے یہ بات نکل چکی ہے کہ ان ستونوں کے اوپر اسلام اور عبادت کی چھت بھی ضروری ہے — ''عبادت'' اور ''عبادات'' کا یہ تصور اگر عام ہو جائے تو واقعہ یہ ہے کہ اُمت کی بہت بڑی اصلاح ہو جائے گی۔ ورنہ ان عبادات کی حیثیت صرف رسومات (rituals) کی رہ جاتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا تھا ع ''رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی!'' موجودہ دور میں یہ رسومات تو بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہیں۔ تقریباً ہر سال حج کی ادائیگی کے لیے مکہ میں پچیس' تیس لاکھ لوگ جمع ہوتے ہیں' جبکہ رمضان کے آخری عشرہ میں یہ تعداد اس سے بھی بڑھ جاتی ہے' لیکن اس کا دنیا پر ماشہ بھر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دنیا جس رنگ میں چل رہی ہے ویسے ہی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں عالی شان مساجد تعمیر ہو رہی ہیں لیکن نماز کی ادائیگی صرف رسومات کی حد تک رہ گئی ہے۔

آج کل ہمارا حال وہ ہو چکا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ایک بہت ہی لرزا دینی والی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آ جائے گا'' ((لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ)) ''کہ اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے کچھ نہیں بچے گا'' ((وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ)) ''اور قرآن میں سے بھی سوائے اُس کے رسم الخط کے کچھ نہیں بچے گا''۔ یعنی قرآن کی صرف تحریر بچ جائے گی اور قرآن کا نظام دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ ((مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى)) ''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی''۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ! اور چوتھی بات سخت ترین ہے: ((عُلَمَاءُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے''۔ ((مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ))(۱) ''انہی میں سے فتنے برآمد ہوں گے اور انہی میں لوٹ جائیں گے''۔ یعنی فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ بدترین زمانے کی پیشین گوئی کی ہے جس کے آثار ہم آج چشمِ سر سے دیکھ رہے ہیں۔

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان' راوی: حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

موجودہ دور میں علاماتِ قیامت کا ظہور

حدیث جبریل میں بھی علاماتِ قیامت میں سے دو کا تذکرہ تھا اور وہ بھی آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ حدیث جبریل میں علاماتِ قیامت کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا)) ''(جب تم دیکھو) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے''۔ اکثر محدثین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد سرکش ہو جائے گی۔ آج ہمارے اردگرد کتنے ہی ایسے بدبخت ہیں جو اپنے والدین کو اذیتیں دیتے ہیں' ان کو گالیاں دیتے ہیں۔ دوسری علامت یہ بیان فرمائی: ((وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ)) ''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں' ننگے بدن' محتاج' بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے''۔ یہ صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے۔ دبئی کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے! سو سال پہلے یہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا' پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے' پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ پورے عرب کا یہی معاملہ تھا۔ حج میں قربانی کا سب سے بڑا مصرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ انہیں کچھ کھانے کو مل جائے اور یہ لوگ تگ و دو کر کے گوشت اکٹھا کرتے اور خشک کر کے سال بھر کھاتے تھے۔ تقریباً ستر اسّی برس سے یہ صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی ہے' جب سے تیل دریافت ہوا ہے' ورنہ اس سے پہلے یہ مشرقی ساحل جہاں آج دبئی اور ابوظہبی جیسے شہر آباد ہیں' یہاں فقط جھونپڑیوں پر مشتمل بستیاں تھیں اور ان کا بکریاں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ خوشحالی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کا پہلا سیون سٹار ہوٹل دبئی میں تعمیر ہوا ہے۔[1]

عباداتِ اربعہ: روحانی ارتقاء کا ذریعہ

اب یہاں دو باتیں انتہائی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث زیر مطالعہ میں مذکور چار عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ نہ صرف ارکانِ اسلام ہیں بلکہ انسان کی روحانی ترقی کا

(۱) بعد ازاں دبئی میں ''برج خلیفہ'' کی تعمیر بھی ہوئی' جو دنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ (مرتب)

ذریعہ بھی یہی ہیں۔ یہ محض قانونی شرط پوری کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر نماز میں خشوع و خضوع پیدا ہو جائے تو یہ ''معراج المؤمنین'' کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اگر روزہ پورے اہتمام سے رکھا جائے کہ آدمی جھوٹ' فحش گوئی اور لہو و لعب سے مکمل اجتناب کرے اور اسے اپنے نفس پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جائے تو یہ روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ اور صدقات کا معاملہ ہے کہ اگر آدمی انفاقِ مال کے سبب دولت کی پرستش سے آزاد ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ قرآن حکیم میں انفاق کا اعلیٰ ترین درجہ یہ بیان کیا گیا ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جو بھی زائد از ضرورت ہو''۔ یعنی اپنی ضرورت اور گزر اوقات کے لیے رکھ لو' باقی راہِ خدا میں دے دو۔

اس مسئلہ میں تھوڑی سی باریکی ہے' کہیں کوئی مغالطہ نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس رکھنا حرام نہیں ہے' بس شرط یہ ہے کہ حلال ذریعے سے کمایا گیا ہو۔ البتہ اعلیٰ روحانیت یہ ہے کہ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کی حد تک اپنا حق سمجھو اور باقی اللہ کی راہ میں دے دو۔ تمہاری ضروریات سے زائد مال محرومین و مساکین کا ہے۔ اللہ نے ان کے مال کو تمہارے حصے میں ڈال کر تمہارا امتحان لیا ہے۔ تمہیں آزمایا جا رہا ہے کہ تم ان کو لوٹا کر سبکدوش ہو جاتے ہو یا ان کے مال پر غاصبانہ قبضہ جما کر بیٹھے رہتے ہو۔ یہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ہے' ورنہ تمہارے لیے اس کا رکھنا جائز ہے' حرام نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' وہ تو زبردستی لے لی جائے گی اور زکوٰۃ کے بعد جو باقی بچتا ہے اس میں تمہیں اختیار ہے۔ تم اسے اپنے پاس بھی رکھ سکتے ہو اور یہ وراثت کے طور پر تمہاری اولاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر روحانی ترقی چاہتے ہو تو ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ تمہارے روحانی ارتقاء کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تمہارا مال ہے اور یہی روح کے لیے سب سے بڑی گندگی ہے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری

زندگی اسی سطح پر گزاری ہے اور کبھی بھی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ میں جب یہ کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی زکوٰۃ نہیں دی تو لوگ اس پر چونک جاتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن کو ادا نہ کریں — زکوٰۃ کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب آپؐ کچھ بچا کر رکھتے اور صاحبِ نصاب ہوتے۔ جب آپ ﷺ نے اپنے پاس کچھ رکھا ہی نہیں تو زکوٰۃ کاہے کی؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خاص طبقہ جنہیں فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کہا جاتا ہے' انہوں نے اسی روحانی و اخلاقی سطح پر زندگی گزاری ہے۔ ان کے سرخیل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرزِ عمل نہیں تھا۔ فقراء صحابہؓ کے علاوہ باقی صحابہ کاروبار بھی کرتے تھے' دولت رکھتے بھی تھے اور اللہ کی راہ میں دیتے بھی تھے۔ البتہ یہ صحابہ بھی ہر وقت آمادہ رہتے تھے کہ جب بھی مطالبہ آئے گا تو سارا مال پیش کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سب کچھ لا کر دے دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر اپنا وافر مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا شمار فقراء صحابہ میں تو نہیں ہے' لیکن آمادگی ہر وقت تھی کہ یہ زائد مال امانت ہے' جب بھی وقت آئے گا' حاضر کر دیں گے۔ چنانچہ یہ عبادات اللہ تعالیٰ کے راستے میں روحانی ترقی کی منزلیں اور سیڑھیاں ہیں۔ انہی سے ہو کر گزریں گے تو روحانی ارتقاء حاصل ہوگا۔

آپ کی نماز دل کی حضوری اور خشوع و خضوع کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر آپ نے بس نماز پڑھ لی تو فقہی اعتبار سے فرض ادا ہو گیا' لیکن اگر خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ نماز پڑھی تو اس سے اعلیٰ درجے کی روحانی ترقی بھی حاصل ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ سجدہ کرو تو یوں محسوس کرو گویا اپنے ربّ کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے۔ نماز میں اس کیفیت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرو کہ جو بھی رحمت والی آیت آئے تو فوراً اللہ سے رحمت کا سوال کرو اور عذاب والی آیت آئے تو فوراً اللہ کے عذاب سے معافی طلب کرو۔ نماز تو ایک طرح کا ڈائیلاگ ہونا چاہیے' جیسے حدیث میں آتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں نے صلوٰۃ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے.....'' علامہ اقبال نے اسے انائے کبیر (The Infinite Ego) اور انائے صغیر (The finite ego) کا مکالمہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انانیتِ کبریٰ کا بیان سورۂ طٰہٰ میں بایں الفاظ ہوا ہے:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ﴿۱۴﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۵﴾﴾

''بے شک میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں' تو میری ہی عبادت کرو' اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

اس کیفیت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو وہ یقیناً روحانی ارتقاء کا باعث ہے۔ نماز وہی ہے' لیکن ادائیگی کی کیفیت کی وجہ سے نماز نماز میں فرق ہے۔

عباداتِ اربعہ: اسلامی تہذیب وتمدّن کی بنیاد

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ جو چار عبادات زیر مطالعہ حدیث میں بیان ہوئی ہیں' اس دنیا میں اسلامی معاشرے کی تنظیم کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' صومِ رمضان اور حج بیت اللہ اسلامی شعائر ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن کی علامات ہیں۔ ان سے دنیا میں اسلامی تہذیب کا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ مساجد اسلامی شعائر میں سے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنی جامع مساجد نہیں ہونی چاہئیں جتنی ہم نے بنالی ہیں۔ مساجد اسلامی تمدن کی علامات بتمام وکمال تب بنیں گی جب اسلامی ریاست قائم ہوگی اور دارالحکومت کی جامع مسجد میں سربراہِ ریاست امام ہوگا۔ اسی طرح صوبائی دارالحکومت کی جامع مسجد میں گورنر خطبہ دے گا' اور اگر کسی چھوٹے علاقے کی مسجد ہے تو وہاں بھی اس علاقے کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر حکومت کی اجازت سے خطبہ دے گا۔ یہ تو ہم نے ایک ایک محلے میں تین تین جامع مساجد بنالی ہیں' ایک اہل حدیث کی' ایک بریلوی کی' ایک دیوبندی کی اور پھر لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ایک دوسرے سے بلند آوازی کے ساتھ مقابلے ہو رہے ہیں۔ بہرحال اس سب کے باوجود مساجد کا وجود غنیمت ہے جن سے دین کا ایک ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن میں مسجد معاشرت کی تنظیم کی بنیاد ہے' بایں معنی کہ ایک علاقے میں پنج وقتہ نماز ہورہی ہے' لوگ جمع ہوتے ہیں' پھر جب کوئی نمازی نہیں آتا تو لوگوں کو تشویش ہونی چاہیے کہ آج فلاں صاحب نہیں آئے' آؤ چل کر پتا کریں۔ ان مساجد کو تو معاشرتی رابطے (social contact) کا ذریعہ بننا چاہیے۔ یہ نہیں کہ نماز کے لیے آئے' نہ کسی کو دیکھا نہ کسی سے کچھ پوچھا' نہ کسی کی کوئی مزاج پُرسی کی' بس سلام پھیرا اور چلے گئے۔ نبی اکرم ﷺ تو نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے۔ دراصل ہمارے ہاں مسجد کا نظام ان ہی چیزوں پر مبنی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حج دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہے جو اس امت کی آفاقیت کا آج بھی سب سے بڑا مظہر ہے۔ اگرچہ آج اس کی روح موجود نہیں رہی' صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے' لیکن پھر بھی یہ مسلمانوں کی آفاقیت کا ایک بہت بڑا نشان ہے ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'' امریکہ کا بہت بڑا مسلم لیڈر مالکوم ایکس (Malcom X) جب حج کے لیے گیا تھا تو بیت اللہ کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ میں نے دنیا بھر میں کہیں ایسا منظر نہیں دیکھا کہ کالے' گورے' پیلے' لال' الغرض ہر رنگ وتہذیب کے لوگ سب ایک جگہ پر ہیں اور اتنا امن ہے کہ کوئی جھگڑا نہیں' کوئی لڑائی نہیں' کوئی فساد نہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ زیر مطالعہ حدیث تین حوالوں سے بہت اہمیت کی حامل ہے: (۱) یہ حدیث ''عبادت'' اور ''عبادات'' کے تعلق کو واضح کرنے والی ہے۔ (۲) اس حدیث میں جن چار عبادات کا تذکرہ ہے وہ ارکانِ اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی ترقی کا زینہ بھی ہیں۔ (۳) یہی چار عبادات اسلام کے شعائر اور مظاہر بن کر معاشرے کی تنظیم کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حُبِّ رسول ﷺ کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

محبت اس جذبے کا نام ہے جو کسی چیز یا شخص کے ساتھ گہری وابستگی کے سبب پیدا ہوجائے۔ محبت کا یہ جذبہ دو طرح کا ہوتا ہے' ایک فطری اور دوسرا شعوری۔ فطری جذبے کا مظہر وہ محبت ہے جو چرندوں' پرندوں' درندوں اور انسانوں میں پیدائشی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اس محبت کا ظہور بڑا واضح ہے کہ انسان اپنی اولاد کے ساتھ' اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ' بہن بھائی اور اقربا آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی اپنے بچوں کے ساتھ محبت رکھتے اور انہیں حفاظت فراہم کرتے ہیں۔

شعوری محبت وہ ہے جو انسان ان ہستیوں کے ساتھ کرتا ہے جن کا احسان' حسن سلوک' نیکی اور عمدہ اخلاق و کردار اسے متاثر کرتے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا محسن تو خود اللہ تعالیٰ ہے جس نے اسے تخلیق کیا' اس کی ضروریات کا انتظام کیا' ماں باپ کے دل میں اولاد اور اولاد کے دل میں ماں باپ کی محبت پیدا کی —— انسان دنیا میں آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا کہ انسان کو اس امتحان میں کامیاب ہونے کا طریقہ بتا دیا۔ شیطان انسان کا واضح دشمن ہے' لہٰذا اس کی ہمہ وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو اس راستے سے بچلا دے جو اُس کی نجات کا باعث ہے۔ شیطان کی اس کوشش کو کامیاب بنانے میں دنیائے فانی کی نقد لذّات' یہاں کی رنگینیاں اور عیش و عشرت کے سامان بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ شیطان کے حملوں سے بچاؤ اور نجات کی راہ سجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیاء و رسل علیہم السلام بھیجے جنہوں نے انتہائی ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور انہیں صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے والے اعمال بتائے' نیز اپنی زندگیوں کا نمونہ بھی پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ کے یہ فرستادہ انسان' انسان ہونے کے باوصف مثالی کردار کے حامل تھے۔ وہ فضائل اخلاق سے ہمہ تن مزیّن اور رذائل اخلاق سے نفور تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں میں

سے بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ انبیاء و رسل علیہم السلام کے اس سلسلے کے آخر میں محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا گیا۔ آپؐ کو رحمۃ للعالمین کی صفت کے ساتھ سرفراز کیا گیا اور آپؐ کو اس کلام سے نوازا گیا جو کمال کی انتہائی بلندی پر ہے۔ پھر اس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ لہٰذا اب نہ کسی نبی اور رسول کے آنے کی حاجت رہی اور نہ ہی کسی نئے کلام کی۔ چنانچہ انسان کی سب سے زیادہ محبت کی حق دار تو خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے انسان پر گوناگوں نعمتوں کے علاوہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعے اس کی ہدایت کا انتظام کیا —— ہر کوئی قدر شناس نہیں ہوتا' اس لیے دنیا میں بہت کم لوگوں نے اس احسان کا احساس کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾﴾ (سبا) ''اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔''

ناشکر گزار لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کی عطا کردہ فطری ہدایت کھو دی اور اللہ کے سوا دوسروں کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور حق سے دور نکل گئے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے' حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ انسان کی حقیقی محبت صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے' باقی جتنی بھی محبتیں ہیں وہ اُس ذات کی محبت کے تابع ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہلِ ایمان جس قدر اللہ سے محبت رکھتے ہیں اتنی زیادہ کامل اور عظیم محبت کوئی کسی مخلوق سے نہیں کرتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کائنات میں کوئی ایسا ہے کہ ہر اعتبار سے اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس سے محبت کی جائے۔'' (۱)

گویا محبت کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت اللہ ہی کے لیے کی جائے گی اور قرآن مجید کا ادب و احترام بھی اللہ سے محبت کی وجہ سے ہوگا۔

سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کا زمانہ تو گزر گیا' اب قیامت تک نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا ہی زمانہ ہے۔ لہٰذا انسانوں کی کامیابی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ وہ کسی اور ہادی یا کسی اور آسمانی ہدایت کا انتظار نہ کریں بلکہ قرآن کو ضابطہ حیات' رسول اللہ ﷺ کو اُسوۂ حسنہ جان کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا حق ادا کریں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہی رسول

اللہ ﷺ کی محبت کا باعث ہے اور یہ اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر اہلِ ایمان کی جماعت میں شریک ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴿۲۴﴾﴾ (التوبة)

''کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہاری اولاد' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے کنبے قبیلے والے' تمہارے کمائے ہوئے مال' اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو' اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو' اگر یہ (سب چیزیں) تمہیں اللہ' اُس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ اگر کسی مؤمن کا رویہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح کی محبت کا نہیں ہے تو وہ فاسق اور ہدایت سے دور ہے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (۲)

''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ' اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اس حوالے سے ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جو حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپؐ عمر بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا: ''نہیں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا) جب تک تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ سمجھو''۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: اب آپ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عمر! اب (تمہارا ایمان کامل ہوا ہے)۔'' (۳)

یہ حدیث گویا تفسیر ہے سورۃ الاحزاب کے ان الفاظ کی: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''پیغمبر مؤمنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ بنی نوعِ انسان کے ہمدرد اور غم خوار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی فردِ بشر ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔ انہوں نے ہدایت کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں بے حد محنت' مشقت اور جدّوجہد کی۔ قرآن مجید میں ربّ السّموات والارض نے آپ ﷺ کی اس جانفشانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۲۸﴾﴾ (التوبة)

''لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں جن پر تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے' وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔''

جو ہستی انسانوں کی اس قدر ہمدرد ہو اُس کی قدر ناشناسی' واقعی انتہائی سنگ دلی اور کٹھور پن ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴿۶۰﴾﴾ (الرحمٰن) ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا''۔ یوں احسان فراموشی بہت بڑا عیب اور گناہ ہے۔ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں آپؐ کی مشغولیت اس حد تک تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴿۶﴾﴾ (الكهف)

''(اے پیغمبر!) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دیں گے۔''

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ ہر شخص کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہو اور اُخروی نجات کا امیدوار ہو جائے' چنانچہ آپ ﷺ دن رات اس بات کے درپے رہے کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی دعوت دیں۔ آپؐ نے گلیوں اور بازاروں میں دعوت دی' محفلوں اور مجلسوں میں دعوت دی' گھروں میں جا کر دعوت دی' فرداً فرداً دعوت دی اور بار بار تذکیر کا حق ادا کیا۔ اس کیفیت کا ذکر نبی مکرم ﷺ نے خود ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''میری اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے (اندھیرے میں) آگ جلائی۔ جب اردگرد روشنی پھیل گئی تو پتنگے اور کیڑے مکوڑے جو آگ میں گرتے ہیں' آگ پر

گرنے لگے۔ وہ شخص انہیں آگ میں گرنے سے روکنے لگا' لیکن وہ اس پر غالب آ کر آگ میں گرتے پڑتے رہے۔ (یہی مثال میری اور تم لوگوں کی ہے) کہ میں تمہیں کمر سے پکڑ کر آگ سے باہر کھینچتا ہوں (لیکن تم لوگ مجھ پر غالب آئے جا رہے ہو) اور آگ میں کود رہے ہو۔''(۴)

یہ تو آپ ﷺ کا مشن تھا' لیکن آپؐ کا اسی پر اکتفا نہ تھا' بلکہ آپؐ اپنی اُمت کی جہنم سے نجات کے اس قدر خواہاں تھے کہ راتوں کو جاگ جاگ کر ان کی ہدایت اور بخشش کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز میں صبح تک (ہر رکعت میں صرف سورۃ المائدۃ کی آیت): ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ ''اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں' اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو بڑا زبردست' حکمت والا ہے'' پڑھتے رہے اور اس پر رکوع اور سجدہ کر لیتے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے آپؐ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپؐ ہر رکعت میں صرف یہی ایک آیت پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی؟ تو آپؐ نے فرمایا:

((اِنِّیْ سَاَلْتُ رَبِّیْ عَزَّوَجَلَّ الشَّفَاعَةَ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْهَا وَهِیَ نَائِلَةٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لِمَنْ لَا یُشْرِكُ بِاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ شَیْئًا)) (۵)

''میں اُمت کے لیے شفاعت کا سوال کر رہا تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا اور یہ شفاعت ان شاء اللہ میری اُمت کے ہر اس شخص کو ملنے والی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرے۔''

اسی طرح ایک رات رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھ اٹھائے اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ کہتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو بھیجا اور انہوں نے آپؐ کے رونے کا سبب پوچھا۔ آپؐ نے بتایا (کہ اُمت کی بخشش چاہتا ہوں) تو حضرت جبریل امین نے واپس جا کر اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر دی' حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جبریل! جاؤ اور محمد ﷺ سے کہہ دو کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں خوش کر دیں گے' آپ کو آزردہ نہیں کریں گے۔''(۶)

نبی اکرم ﷺ اُمت کے درد میں نہال تھے اور اللہ تعالیٰ سے اُمت کے لیے کثرت کے ساتھ بخشش کی دعا کیا کرتے تھے۔ صحیحین کی ایک روایت' جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں' کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لِكُلِّ نَبِیٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ یَدْعُوْ بِهَا وَاُرِیْدُ اَنْ اَخْتَبِئَ دَعْوَتِیْ شَفَاعَةً لِاُمَّتِیْ فِی الْاٰخِرَةِ)) (۷)

''ہر نبی کی ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے (تمام انبیاء علیہم السلام نے اس دعا کو استعمال کر لیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ اس دعا کو آخرت میں اپنی اُمت کی شفاعت کے لیے چھپا رکھوں۔''

یہ تھی رسول اللہ ﷺ کی اپنی اُمت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی۔

ان حقائق کو جان لینے کے بعد ہر اہلِ ایمان کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں مخلص ہو اور آپؐ کے فرامین پر خوش دلی کے ساتھ عمل کرنے کا ارادہ کر لے۔ جن کاموں سے آپؐ ناراض ہوتے ہیں ان کے قریب بھی نہ جائے۔ حبِ رسول زبانی عقیدت کا نام نہیں اور نہ ہی چند نمائشی کام کر لینا کافی ہے۔ حبِ رسول تو یہ ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ کا حکم آ جائے وہاں اہلِ ایمان کا سر جھک جائے اور وہ فرمانِ رسول کے مقابلے میں کسی دوسرے کی رائے کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں۔ انسان اپنے کردار و عمل کا جائزہ لے کر خود اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کتنی محبت ہے۔

اگر کوئی شخص ہر پیش آنے والی صورت حال میں فرمانِ نبویؐ پر عمل کرنے کو ضروری سمجھتا ہے' آپؐ کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے' اور اس حوالے سے نفع اور نقصان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو اس کی محبت کا دعویٰ سچا ہے۔ اور اگر ایک شخص اپنے کردار و عمل میں اپنی خواہش نفس کا غلام ہے' خود بھی رسول اللہ ﷺ کے احکام توڑ رہا ہے اور دوسروں کو بھی خلافِ سنتِ رسول کام کرنے سے اس کے دل پر چوٹ نہیں لگتی تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

حواشی

(۱) بحوالہ محبت رسول' از مقصود الحسن فیضی' ص ۴۵۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ اکثر من الاهل والولد والوالد۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الایمان والنذور' باب کیف کانت یمین النبی ﷺ۔

(٤) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب الانتهاء عن المعاصی۔

(٥) مسند احمد' کتاب مسند الانصار' باب حدیث ابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ' ح ۲۰۳٦٥۔

(٦) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب دعاء النبی ﷺ لامته وبکائه شفقة علیهم۔

(۷) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب لکل نبی دعوة مستجابة۔

حسنِ نیّت — نیک عمل کی اساس

عتیق الرحمٰن صدیقی

ہم اپنی شب و روز کی زندگی میں کسی نہ کسی کام میں ضرور منہمک ہوتے ہیں' ہماری اس سرگرمی اور عمل کے محرکات یا عوامل کیا ہیں؟ کیا کسی دنیوی مصلحت اور منفعت کی خاطر ہم سرگرمِ عمل ہوتے ہیں یا کلمۃ اللہ کا ابلاغ اور غلبہ مقصود ہوتا ہے یا وقت گزاری مطلوب ہوتی ہے؟ یہ حقیقت عامل پر منکشف ہوتی ہے یا اس کے عمل کا تسلسل اس راز کو واضح اور مبرہن کرتا ہے اور گاہے برسہا برس تک یہ عقدہ لاینحل ہی رہتا ہے۔ اس سرنہاں کو اگر ہم نیت سے تعبیر کریں تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ نیت خلوص سے بھی مملو ہوتی ہے اور ملاوٹ سے بھی' بہرحال اس کا محل قلب ہے۔

ارادہ اور نیت کا مفہوم

امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ:

''نیت' ارادہ' قصد' یہ تین الفاظ ایک ہی معنی کے لیے بولے جاتے ہیں۔ ہر عمل یعنی ہر اختیاری حرکت وسکون تین چیزوں سے پورا ہوتا ہے: علم' ارادہ اور قدرت۔ انسان اسی چیز کا ارادہ کرتا ہے جس کا اسے علم ہو' کسی چیز کو جانے بغیر اس کا ارادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح انسان کسی چیز پر عمل نہیں کرسکتا جب تک اس کا ارادہ نہ کرے۔ علم اور ارادے کے باوجود کوئی عمل وجود میں نہیں آسکتا جب تک انسان کو اس کی قدرت نہ ہو' مثلاً جس کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہوں وہ علم اور ارادہ کے باوجود نہ کسی چیز کو اُٹھا سکتا ہے اور نہ کہیں جاسکتا ہے۔'' (۱)

امام غزالیؒ نے ارادہ' قصد' نیت اور عزم کو ہم معنی الفاظ گردانا ہے' مگر محققین کے نزدیک ان میں فرق ہے' اور وہ یہ کہ ارادہ میں مقصود کسی فعل کو وجود میں لانا ہوتا ہے خواہ اس کی کوئی غرض ہو یا نہ ہو' اور نیت میں ایجادِ فعل کے ساتھ فاعل کی کوئی غرض بھی وابستہ ہوتی ہے۔ گویا شرعی طور پر نیت کا معنی ہے: الارادة المتوجهه نحو الفعل لابتغاء رضاء الله وامتثال حكمه ''کسی فعل کا ایسا ارادہ جس میں رضائے الٰہی کا حصول اور حکمِ خداوندی کی تکمیل مقصود ہو نیت کہلاتا ہے۔'' (۲)

نیّت کی اقسام

حدیث مبارکہ میں نیت کی دو قسموں کا بیان ہے' ایک نیت حسنہ اور دوسری نیت قبیحہ' یعنی اگر نیت اچھی ہو تو عمل کا اچھا پھل ملتا ہے اور اگر نیت بری ہو تو نتیجہ برا ہوتا ہے۔ کوئی عمل خواہ کتنا ہی بڑا ہو اللہ کے نزدیک اس کی قدر و قیمت اسی وقت قائم ہوتی ہے جب وہ خالصتاً اللہ کی رضا کی خاطر کیا گیا ہو' اور اسی طرح کوئی عمل چاہے وہ کتنا ہی اچھا اور نیک ہو اس کے اجر کا استحقاق آخرت میں اسی صورت میں ملے گا جب اللہ کی خوشنودی پیش نظر ہو۔ اگر اس کا محرک کوئی دُنیوی غرض ہو تو ربّ العالمین کے ہاں وہ بے قیمت اور غیر اہم قرار پائے گا۔

نیت کا فاسد جذبات اور منفی محرکات سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی نمازی اس لیے نماز پڑھتا ہو کہ لوگ اسے نیک سمجھیں' یا ایک آدمی حج کا فریضہ اس لیے ادا کرتا ہو کہ وہ حاجی اور الحاج کے نام سے پکارا جائے' یا کوئی شخص مفلسوں اور ناداروں پر اس لیے خرچ کرتا ہے کہ سخی اور فیاض کے نام سے معروف ہو جائے تو ایسے عمل کی اس وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں کوئی وقعت نہیں اور ایسا شخص اجر و ثواب سے یقیناً محروم رہے گا۔

اِنّما الاعمال بِالنّیّات

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کے آغاز میں ''کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ'' کا عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت جو پہلی حدیث لائے ہیں وہ ہے: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ.....الخ))۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں سات مقامات پر آئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث صحیح مسلم' سنن ترمذی' سنن نسائی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ' مسند احمد اور دیگر کتب احادیث میں بھی وارد ہوئی ہے۔ حدیث کا متن ملاحظہ کیجیے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیٍٔ مَا نَوٰی' فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ' وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ)) (۳)

''اعمال کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی' پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی ہوگی اس کی ہجرت واقعی اللہ اور اس کے رسول کی طرف شمار ہوگی اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے

شادی کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف شمار ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔''

حدیث کا پس منظر

امام نوویؒ نے درج بالا حدیث ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ.....)) کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور اس کی غرض یہ تھی کہ وہاں ایک عورت سے شادی کرے۔ اسی موقع پر نبی مکرم ﷺ نے یہ قول ارشاد فرمایا تھا۔ اس شخص کے پیش نظر اللہ کی رضا نہ تھی اور وہ اپنے رب کے ہاں کسی اجر وثواب کا طالب نہ تھا' بس اس عورت کو پالینے کی ایک خواہش تھی جو اس کے دل میں مچل رہی تھی۔ لہٰذا اس کی ہجرت اس عورت کی طرف ہی شمار ہوگی نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے۔ اسی لیے اس شخص کو اس عورت کے نام سے ''مہاجرِ اُمّ القیس'' کہا جانے لگا۔

عبادات ومباحات

اعمال تین قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں: عبادات وطاعات' مباحات اور سیئات۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں کا تعلق عبادات وطاعات سے ہے' تمام تر جائز کام مباحات میں داخل ہیں اور برائیاں سیئات کے زمرے میں آتی ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث میں اعمال کی پہلی دو قسمیں شامل ہیں' برے اعمال سے یہاں بحث نہیں' اس لیے کہ برا عمل اگر کسی اچھی نیت سے بھی کیا جائے تو وہ اچھا نہیں ہوسکتا۔ چوری اور ڈاکہ اگر اس غرض سے کیا جائے کہ اس مال سے ناداروں کی معاونت کی جائے گی یا گانے بجانے کی محفل اس لیے سجائی جائے کہ اس سے حاصل کی جانے والی رقم سے مسجد کی تعمیر یا یتیموں کی کفالت کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے گا تو اچھی نیت سے کیا جانے والا یہ برا عمل اچھا نہیں کہلائے گا۔ جو کام شرعاً ممنوع ہیں ان کا ارتکاب گناہ ہے اور پھر خیر کی نیت سے اسے انجام دینا تو ایک بڑی برائی ہوگی۔ اچھی اور بری نیت کا سوال طاعات وعبادات اور مباحات ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں درِ قبولیت اسی وقت وا ہوتا ہے جب کوئی کام حسنِ نیّت سے کیا جائے اور شریعت سے بھی مطابقت رکھتا ہو۔ حسنِ نیّت اور شریعت سے مطابقت دو ایسے امور ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی غائب ہو تو عبادت باقی نہیں رہے گی' البتہ جن امور میں شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ان کی انجام دہی میں حسنِ نیت کفایت کر جائے گی۔

اچھی نیّت کا مفہوم

اچھی نیت کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت ہو یا کوئی کارِ خیر وہ اللہ کا تقرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ مکّہ مکرّمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے تھا اور اہلِ ایمان پر یہ فرض تھا کہ وہ اس حکم کی پیروی کریں۔ اس موقع پر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اس کی ہجرت اللہ ورسول ہی کی طرف ہوگی' گویا جس کی ہجرت اللہ کی رضا اور فرمانِ رسول کی تعمیل میں ہوئی اس کا اجر وثواب واضح ہوگیا۔ علامہ نووی نے فرمایا: ''معناہ من قصد بھجرتہ وجھہ اللّٰہ وقع اجرہ علی اللّٰہ''(٤) یعنی جس نے اپنی ہجرت سے اللہ کی رضا کا قصد کیا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ثابت ہوگیا۔ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہو' اس میں خواہش نفسانی کا کوئی دخل نہ ہو اور اگر کوئی غرض ہو تو وہ صرف یہ کہ اس سے خدائے بزرگ وبرتر کی خوشنودی مقصود ہو۔ جیسے باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝۲۰ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۲۱﴾ (الیل) ''مگر (جو مال دیتا ہے) اپنے بلند مرتبہ مالک کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے' وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔''

انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت' دُنیوی غرض سے براءت

انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت وتبلیغ کے دوران بار بار یہ اعلان کرتے رہے کہ انہیں نہ تو اس سے کوئی دنیوی غرض ہے اور نہ وہ کسی معاوضہ اور اجر کے طالب ہیں۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا: ﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۹﴾ (الشعراء) ''اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا' میری مزدوری تو اُس کے ذمہ ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے''۔ ایک موقع پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ﴾ (ھود:٢٩) ''اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں' میری مزدوری تو اللہ کے ذمہ ہے''۔ خود نبی مکرم ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا کہ میں تم سے اپنے لیے کسی اجرت کا طلب گار نہیں' میں تو صرف تمہاری ہدایت کا متمنّی ہوں: ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۴۷﴾ (سبا) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں نے تم سے کچھ اجرت چاہی ہو تو وہ تمہاری' جبکہ میری اُجرت تو اللہ کے ذمہ ہے' اور وہ ہر بات پر

گواہ ہے''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۵۷﴾ (الفرقان) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے''۔ گویا نیکی کا کوئی کام بھی کیا جائے وہ ریا' نمود اور دکھاوے سے بالا ہو' بے غرض اور بے منفعت ہو' تحسین و شہرت اور مال و دولت کی طلب سے پاک ہو۔

نیک لوگوں کی اہم خصوصیت

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نیک لوگوں کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹﴾ (الدھر) ''اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ''۔ ان آیات میں لِوَجْهِ اللّٰهِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' جبکہ دوسرے مقامات پر ''رِضْوَانَ اللّٰهِ'' اور ''مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' کی تعبیریں بھی رضائے الٰہی کے لیے استعمال کی گئی ہیں' اس لیے کہ نیک عمل سے اصل مقصود اللہ کی رضا کا حصول ہے اور اگر وہ حاصل ہو جائے تو مسرت و انبساط کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ :يَااَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَقُوْلُوْنَ: لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ' فَيَقُوْلُ: هَلْ رَضِيْتُمْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: وَمَالَنَا لَا نَرْضٰى يَا رَبِّ وَقَدْ اَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ' فَيَقُوْلُ؟ اَلَا اُعْطِيْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ؟ فَقَالُوْا: يَارَبِّ وَاَيُّ شَيْءٍ اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ؟ فَيَقُوْلُ : اُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِيْ فَلَا اَسْخَطُ لَكُمْ بَعْدَهٗ اَبَدًا))(۵)

''اللہ عزوجل اہلِ جنت سے فرمائیں گے: اے اہلِ جنت! وہ کہیں گے: اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں' ساری بھلائی اور خیر تیرے قبضہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تم راضی ہو گئے ہو؟ وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم کیسے راضی نہ ہوں گے جبکہ آپ نے ہمیں وہ کچھ عطا فرما دیا ہے جو مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا نہ کروں؟ وہ کہیں گے: اس سے

افضل چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں تم پر اپنی رضا نازل کرتا ہوں' پس اس کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا۔''

اس پر اہل جنت کو ایسی خوشی و مسرت حاصل ہو گی جس کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔

اِخلاص اور عدمِ اِخلاص کے مابین فرق

ماقبل بیان کردہ حدیث اخلاص اور عدم اخلاص کے مابین فرق کو واضح کر رہی ہے۔ کسی نیک کام کے پردے یا آڑ میں دنیا کے کسی فائدے کو مقصد بنانا نیت کا بدترین پہلو ہے۔ یہ ایک طرح کی منافقت ہے۔ دین فروش اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھے ہوئے لوگ اسی انداز میں سادہ لوح' بھولے بھالے اور جاہل بندوں کو لوٹنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ مذکورہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ہجرت اگر دنیوی فائدہ کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے تو وہ اسی کے لیے شمار ہو گی۔ امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے: **ومن قصد بها دنيا او امرأة فهي حظه ولا نصيب له في الآخرة بسبب هذا الهجرة** ''اور جس نے ہجرت سے دنیا یا کسی عورت کا قصد کیا تو وہی اس کا حصہ ہے اور اس ہجرت کی وجہ سے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔''

حسنِ نیّت و اِخلاصِ نیّت

نماز' روزہ' حج اور قربانی کی حقیقی روح حسن نیت اور اخلاصِ نیت ہے' اگر یہ روح عنقا ہو تو وہ ایک مردہ جسد کی مانند ہے۔ ظاہر کتنا ہی حسین و خوشنما اور پُرکشش ہو مگر باطن میں خبث اور فساد پنہاں ہو تو اللہ کے ہاں اس کام کی کوئی وقعت نہ ہو گی اور وہ خسران کا باعث ہو گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) (۶)

''اللہ تمہاری شکل و صورت اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے اللہ کے حضور اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں۔ اللہ نے ان میں سے ایک کی قربانی کو قبول کیا اور اپنا ابدی اصول ظاہر فرما دیا: ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷﴾ (المائدۃ) ''اللہ تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

قربانی کرنے والوں سے کہا گیا کہ اللہ کو جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ بندے کا تقویٰ پہنچتا ہے کہ اس نے کس نیت سے خون بہایا ہے‘ اللہ کی خوشنودی کے لیے یا کسی دنیوی غرض کے لیے۔ معلوم ہوا کہ اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اَخلاق ومعاملات عبادت کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر کام کا آغاز کرتے وقت نیت کو غیر مخلصانہ غرض وغایت سے بالاتر رکھا جائے۔ دین ودنیا کی فوز وفلاح کا راز اسی میں مضمر ہے اور بارگاہِ ایزدی میں محبوبیت کا مقام اخلاصِ نیت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

فاسد نیّت کا ثمرہ

کوئی عمل وہ کتنا ہی عظیم اور افضل کیوں نہ ہو اگر نیت میں بگاڑ اور فساد موجود ہے‘ یعنی رضائے الٰہی کا جذبہ مفقود ہے‘ تو وہ شرعی اعتبار سے اللہ کے ہاں معتبر نہیں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’قیامت کے دن جب ہر جماعت گھٹنوں کے بل گری ہوگی اور اللہ جل شانہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے جلوہ افروز ہوں گے تو سب سے پہلے جن اشخاص کو حاضر کیا جائے گا ان میں ایک وہ شخص ہوگا جو قرآن کریم کا حافظ وقاری ہوگا‘ دوسرا مجاہد ہوگا جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوگیا‘ جبکہ تیسرا وہ سخی ہوگا جو دنیا میں بہت زیادہ مال ودولت کا مالک تھا۔ اللہ تعالیٰ قاری سے فرمائیں گے: کیا میں نے تمہیں اس کلام کا علم نہیں عطا کیا تھا جو میں نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا؟ وہ کہے گا: ہاں‘ اے میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: میں نے تمہیں جو علم عطا کیا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں تیری رضا کے لیے دن رات قرآن پڑھتا پڑھاتا رہا اور تیری عبادت میں مصروف رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم غلط کہتے ہو‘ فرشتے بھی کہیں گے تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارا مقصد صرف یہ تھا کہ (لوگ تمہیں کہیں) فلاں کیا ہی قاری ہے‘ اور یہ بات کہہ دی گئی —— صاحب المال کو جب حاضر کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس سے فرمائیں گے: کیا میں نے تمہیں اتنا کثیر مال نہیں دیا تھا کہ تم کسی کے محتاج نہیں رہے؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں‘ اے میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم نے میرے دیے ہوئے مال میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! میں صلہ رحمی کے طور پر اپنے رشتہ داروں کو دیتا رہا اور صدقہ وخیرات کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم غلط کہتے ہو۔ فرشتے بھی کہیں گے تم جھوٹ بولتے ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تمہاری

نیت صرف یہ تھی کہ تمہیں بہت بڑا سخی کہا جائے‘ سو کہا گیا —— پھر اس شخص کو پیش کیا جائے گا جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا‘ اللہ تعالیٰ اُس سے فرمائے گا: تم کیسے مارے گئے؟ وہ کہے گا: اے اللہ! تو نے اپنے راستے میں جہاد کا حکم دیا‘ میں (کفار سے) لڑتا رہا یہاں تک کہ شہید ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے غلط کہا‘ فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تمہاری نیت تو یہ تھی کہ لوگ کہیں فلاں بڑا بہادر ہے‘ سو کہا گیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: ’’اے ابوہریرہ! اللہ کی مخلوق میں سے یہ پہلے تین اشخاص ہوں گے جن پر قیامت کے دن (جہنم کی) آگ پوری شدت سے بھڑکائی جائے گی۔‘‘(۷)

حضرت معاویہ ؓ نے جب یہ حدیث سنی تو پکار اٹھے ’’صَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ‘‘ کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔

قرآن سیکھنا سکھانا یقیناً ایک نہایت مستحسن عمل ہے‘ سخاوت کے نیک عمل ہونے میں بھی کلام نہیں اور جہاد کی فضیلت بھی شک وشبہ سے بالا ہے‘ مگر نیت درست نہ ہو تو یہ سب اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پھل

سورۂ ھود میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝۱۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۡ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾

’’جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں‘ ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم ان کو یہیں (دنیا میں) دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے (وہاں معلوم ہو جائے گا) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا سب ملیا میٹ ہوگیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ اعمال کا تمام تر دارومدار نیتوں پر ہے‘ اس لیے احتساب کرتے وقت نیت کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔ نیت میں فطور اجر وثواب کو بھی اکارت کر دیتا ہے اور بعض اوقات سزا کا بھی موجب بنتا ہے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ ؓ نے جب ایک خط کے ذریعے اہلِ مکہ

کو رسول اکرم ﷺ کی مکہ روانگی کے بارے میں مطلع کرنے کی کوشش کی تو ان کا یہ عمل ایک سنگین غلطی کے مترادف تھا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو فرما رہے تھے: یارسول اللہ! مجھے اس منافق کی گردن اڑانے کی اجازت دیجیے۔ انہوں نے تلوار بھی سونت لی تھی' لیکن جب حضرت حاطبؓ نے معذرت کی اور کہا: اس خط کے ذریعے میرا رسول اللہ ﷺ اور اہلِ اسلام سے خیانت یا انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اس لیے کیا کہ میں کافر اور مرتد ہو گیا ہوں یا اسلام قبول کرنے کے بعد پھر سے کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ میں تو صرف قریش پر ایک احسان کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے بدلے میں میرے گھر والوں (جو مکہ میں رہائش پذیر ہیں) کی حفاظت کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ تم سے سچ کہہ رہا ہے اے ابن الخطاب! اور یہ غزوۂ بدر میں بھی شامل تھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر سے فرمایا ہے: ((اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ))(۸) ''تم جو چاہو عمل کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے''۔ اگرچہ حضرت حاطبؓ کا عمل بالکل غلط تھا لیکن نیت غلط نہ تھی اس لیے معاف کر دیا گیا۔ اسی حوالے سے حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں (نیتوں) اور اعمال کو دیکھتا ہے۔''

دل: اعمال کی تحریک کا مرکز

انسان سے اچھے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں اور برے بھی' لیکن ان اعمال کی تحریک کا مرکز ایک ہی ہے اور وہ دل ہے۔ عقائد ہوں یا عبادات' اخلاق ہوں یا معاملات' یہ تمام امور دل کے سوتے سے پھوٹتے ہیں۔ اعمال کا ہر گوشہ آئینہ دل کا عکاس ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ، اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ))(۹)

''جان لو کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے' جب یہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب یہ فساد کا شکار ہو جائے تو سارا جسم فساد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جان لو کہ یہ لوتھڑا 'دل' ہے۔''

اس حدیث کی شرح میں صاحبِ ''اربعین'' امام نوویؒ لکھتے ہیں:

''جسم میں ایک لوتھڑا ہے' جب یہ خشوع کی روش اختیار کر لے تو بقیہ اعضاء و جوارح

اس کی پیروی کرتے ہیں اور یہ غرور و تکبّر کا رویہ اپنا لے تو سارا جسم اس کے تابع ہوتا ہے۔ اگر یہ عضو فساد میں مبتلا ہو جائے تو دیگر اعضاء بھی مبتلائے فساد ہو جاتے ہیں۔ علماء کہتے ہیں: بدن ایک مملکت ہے اور نفس اس کا شہر ہے' دل اس مملکت کا مرکز ہے ..... یہ بھی کہا گیا ہے کہ سماعت و بصارت اور قوتِ شامہ وہ روزن ہیں جن میں سے جسم دیکھتا ہے اور دل اس مملکت کا بادشاہ ہے۔ جب بادشاہ درست ہو گا تو رعایا بھی درست ہو گی اور جب یہ خرابی کا شکار ہو گا تو رعیت بھی خرابی میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس بادشاہ (دل) کی درستی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ یہ حسد' کینہ' بغض' بخیلی' کنجوسی' تکبّر' شہرت پسندی و ریاکاری' مکر و فریب' حرص و طمع اور قسمت پر راضی نہ رہنے جیسے باطنی امراض سے محفوظ رہے۔'' (۱۰)

اختتامیہ

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''عمل کا اصل پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے' اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لیا جائے۔ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔'' (۱۱)

حواشی

(۱) بحوالہ اسلامی تصوف از سید احمد عروج قادری۔

(۲) معین القاری شرح صحیح البخاری۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی و کتاب الایمان و کتاب العتق۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ انما الاعمال بالنیۃ.....

(٤) نووی: شرح مسلم' ج۱۔

(٥) صحیح البخاری' کتاب الرقاق و کتاب التوحید' باب کلام الرب مع اھل الجنۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب معرفۃ طریق الرؤیۃ۔

(٦) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ.....

(۷) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ۔ وسنن الترمذی' کتاب الزھد (الفاظ سنن ترمذی کے ہیں)

(۸) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب الجاسوس۔

(۹) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبھات۔

(۱۰) اربعین نووی' ترجمہ ارشاد الرحمن' ص۹٤۔

(۱۱) سیرت النبی ﷺ' ج٥' ص ۳٦۷۔

❁❁❁

حق مہر کے لیے قرآن حکیم میں وارد الفاظ

حافظ محمد مشتاق ربّانی

نکاح کے سارے عمل میں حق مہر خاص اہمیت رکھتا ہے اور اسے خوشدلی سے ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی جتنی تاکید ہے ہمارے ہاں بالعموم اس کی ادائیگی میں اسی قدر کوتاہی ہوتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ''اسلامی شادی'' میں فرماتے ہیں:

''ایک کوتاہی جو بعض اعتبار سے سب سے زیادہ سخت ہے یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مہر دینے کا ارادہ ہی دل میں نہیں رکھتے' پھر خواہ بیوی بھی وصول کرنے کا ارادہ کرے اور خواہ طلاق یا موت کے بعد اُس کے ورثاء وصول کرنے کی کوشش کریں' لیکن ہر حال میں شوہر کی نیت ادا کی نہیں ہوتی۔ لوگوں کی نگاہ میں یہ نہایت سرسری معاملہ ہے' حتیٰ کہ مہر کی قلّت وکثرت (کمی وزیادتی) میں گفتگو کے وقت بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے۔ یہ لوگ صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے' دینے لینے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' (اس کتاب میں حضرت تھانوی کے افادات جمع ہیں' جن کو مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی نے مرتب کیا ہے۔)

ایسی سوچ رکھنا کہ زیادہ مہر لکھوا لیتے ہیں کون سا ادا کرنا ہے' مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ مسلمان کے سارے کام رضائے الٰہی اور اللہ کے احکامات کی تعمیل کے لیے ہونے چاہئیں۔ کاموں کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے کام جن میں نیت صاف نہ ہو اپنے اندر فساد رکھتے ہیں۔ پھر کئی لوگ اپنی حیثیت سے نہایت کم حق مہر مقرر کرتے ہیں اور اکثر مؤجل/غیر معجّل لکھوا کر عمر بھر ادا نہیں کرتے' حالانکہ مؤجل میں تاریخ کا تعین ہونا چاہیے کہ شوہر کب ادا کرے گا۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شوہر کو باندھنے کے لیے لڑکی والے شوہر کی مالی استطاعت مدّنظر رکھنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ حق مہر مقرر کرواتے ہیں تاکہ شوہر لڑکی کے تابع رہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ مرد اپنی مالی حیثیت کو سامنے رکھ کر حق مہر مقرر کرے اور دینے کی غرض سے معیّن کرے۔ لڑکی والوں سے حق مہر مقرر کرنے کے حوالے سے مشاورت کی جاسکتی ہے' لیکن ہر صورت میں مرد کی مالی حیثیت کو ضرور پیش نظر رکھا جائے۔

''مہر'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ احادیثِ نبویہ میں وارد ہوا ہے' قرآن حکیم میں وارد نہیں ہوا۔ قرآن حکیم میں ''مہر'' کے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ **اُجور**' **صدُقات**' **فریضہ** اور **نفقة** کے ہیں۔ ذیل کی سطور میں لغوی اعتبار سے ان کی وضاحت پیش کی جارہی ہے۔

اُجُور: اس کا واحد اَجر ہے۔ لسان العرب میں اجر کا معنی **الجزاء علی العمل** بیان ہوا ہے' یعنی کام کے عوض ملنے والا معاوضہ۔ قرآن حکیم میں اُجُور کا لفظ حق مہر کے لیے مجازاً استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء: ۲۵) ''اور ان کے حق مہر بھلے طریقے سے ادا کردیا کرو''۔ یہ الفاظ لونڈیوں کے تناظر میں وارد ہوئے ہیں' یعنی ان کو لونڈی سمجھ کر ان کے مہر کو غیر اہم نہ سمجھا جائے۔ آزاد عورتوں کے حوالے سے بھی اُجُور کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ (النساء: ۲۴) ''پس ان میں سے جن سے تم نے تمتع کیا ہو تو ان کو ان کے مہر ادا کرو' فریضہ کی حیثیت سے''۔ **فریضہ** مصدر ہے جو یہاں بطور حال استعمال ہوا ہے۔

صَدُقات: اس کا واحد صَدُقة ہے۔ احادیث اور کتب فقہ میں ''صِداق'' کی اصطلاح آتی ہے۔ صدَقة دال کی زبر سے ہو تو اس کے معنی خیرات ہے اور دال پر ضمہ (پیش) ہو تو اس کے معنی حق مہر ہے۔ صَدُقة کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق مہر کوئی ایسی ادائیگی نہیں جس سے عورت کو خریدا جاتا ہے' بلکہ یہ ایک تحفہ ہے جسے خوشی سے معین کیا جاتا ہے۔ اس سے اخلاص (صدق) اور حق وفا کو تقویت پہنچتی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء: ۴) ''اور دے دیا کرو عورتوں کو اُن کے مہر خوش دلی سے''۔ یہ مختصر کلمات نہایت اہم اُمور کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم اپنی تالیف ''دستورِ حیا'' (سورۃ النساء کی تفسیر) میں مندرجہ ذیل نکات کی نشاندہی کرتے ہیں:

(۱) جن عورتوں سے تم نکاح کرو ان کے مقرر کردہ مہر ان کی طرف سے تقاضا و اصرار کے بغیر ہی خود بخود خوشی سے ادا کردو۔ یہ ان کا حق ہے۔

(۲) مہر کے معاملے میں عورت کو نقصان پہنچانے والے جاہلی رواج اور طریقے استعمال نہ کرو۔ مثلاً:

(i) کسی بے آسرا لڑکی سے کم مہر پر نکاح کرلینا۔

(ii) اپنی زیر پرستی پلنے والی یتیم لڑکیوں کو بددلی سے نہایت حقیر مہر پر یا بغیر مہر کے ہی بیاہ دینا۔

(iii) نکاحِ شغار کے ذریعے بلا مہر دو لڑکیوں کا باہم تبادلہ کرلینا۔

(iv) ولی کا مہر لے کر خود رکھ لینا اور لڑکی کو اس میں سے کچھ نہ دینا وغیرہ — زمانۂ جاہلیت میں یہ سب رواج موجود تھے' اسلام نے انہیں ختم کر دیا۔

(۳) عورتوں کے مہر اتنے ہی باندھو جو بخوشی ادا کر سکتے ہو۔ صرف نمود و ریا کے لیے ہزاروں اور لاکھوں کے فرضی مہر باندھنے اور پھر ''سوا من مچھروں کی چربی'' کی قسم کی فضول شرائط سے پرہیز کرو۔

حق مہر کو بوجھ نہیں سمجھنا چاہیے' بلکہ پوری دلی آمادگی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ یہاں صَدُقات کے ساتھ نِحْلَة کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے: ''نحلة: عطية..... اذا أعطاه إيّاه عن طيب نفس بلا توقع عوض ''یعنی ''نحلة اس عطیہ کو کہتے ہیں جو خوشی خوشی کسی معاوضہ کے لالچ کے سوا دیا جائے''۔ نحلة کا ترجمہ بعض مفسرین کرام نے عطية واجبة/فريضة لازمة سے کیا ہے' جیسا کہ تفسیر القرطبیؒ میں معروف تابعی قتادہؒ سے نقل ہے کہ اس کا معنی فريضة واجبة ہے۔

فريضة: فرض' یعنی مقرر کرنا' متعیّن کرنا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ (البقرة:۲۳۷) ''اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا''

نفقة: خرچ۔ یہ اصطلاح تو خرچ کرنے کے حوالے سے عمومی طور پر بیان ہوئی ہے' لیکن سورۃ الممتحنہ میں انفاق سے مشتق فعل انفقوا اور انفقتم حق مہر کے مفہوم میں وارد ہوئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا﴾ (الممتحنة: ۱۰) ''اور جو کچھ انہوں نے (ان پر) خرچ کیا ہو' وہ ان کو دے دو''۔ (ترجمہ: فتح محمد جالندھریؒ) کئی مترجمین نے یہاں اَنْفَقُوْا کا ترجمہ حق مہر کے مفہوم سے کیا ہے۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ ''ضیاء القرآن'' میں یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''اور دے دو کفار کو جو مہر انہوں نے خرچ کیا''۔ ان الفاظ میں یہ بیان ہو رہا ہے کہ جو مسلمان عورتیں دارالاسلام میں آ جائیں اور ان کے شوہر کافر ہی رہیں تو اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ ان عورتوں کے شوہروں کو حق مہر واپس کرے۔ اسی بات کو مزید مؤکد انداز میں آگے پھر فرمایا: ﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (الممتحنة: ۱۰) ''اور کافروں کی ناموس کو قبضے میں نہ رکھو اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو ان سے طلب کر لو اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کر لیں''۔ (ترجمہ: فتح محمد جالندھریؒ)۔ قرآن حکیم کے اس مقام پر انفاق کا ذکر ہوا ہے' جس سے مراد حق

مہر ہے۔ ابوبکر الجصّاص (ت ۳۷۰ھ) کی احکام القرآن میں زہریؒ سے منقول ہے کہ اس سے مراد ''ردّ الصِداق'' یعنی حق مہر کا لوٹانا ہے۔ کئی مترجمین نے اس جزء کا ترجمہ بھی حق مہر کے لفظ سے کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ اس مقام کا یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رہو۔ جو مہر تم نے اپنی کافر بیویوں کو دیے تھے وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان عورتوں کو دیے تھے انھیں وہ واپس مانگ لیں۔''

﴿وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا﴾ کی وضاحت ﴿وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا﴾ کے ذیل میں بیان ہوگئی' لیکن ﴿وَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ﴾ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تمہاری جو بیویاں دارالکفر میں رہ جائیں' یعنی وہ مسلمان نہ ہوں اور ان کے شوہر مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آ جائیں تو مسلمان شوہر کفار سے اپنے مہر کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور کفار کو چاہیے کہ ان کے حق مہر لوٹائیں' کیونکہ ان کے مسلمان ہونے اور اختلافِ دارین کی وجہ سے ان کا آپس کا ازدواجی معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اگر کفار وہ حق مہر واپس نہ کریں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مالِ غنیمت سے ان مسلمان خاوندوں کو مہر کی رقم ادا کریں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (الممتحنة:۱۱) ''اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے (اور اس کا مہر وصول نہ ہوا ہو) پھر تم ان سے جنگ کرو (اور ان سے تم کو غنیمت ہاتھ لگے) تو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں ان کو (اس مال میں سے) اتنا دے دو جتنا انھوں نے خرچ کیا تھا۔''

یہ چاروں کلمات (اُجور' صدُقات' فريضة اور نفقة) اس بات کی راہنمائی کرتے ہیں کہ حق مہر میں ہرگز کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور اس کی ادائیگی بطیبِ خاطر ہونی چاہیے۔ اس کے سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ حساس ہونا چاہیے' کیونکہ مہر ادا نہ کرنے کی صورت میں یہ انسان کے ذمے ایک قرض ہے اور قرض کے ادا نہ کرنے پر انسان سے پوچھ گچھ ہوگی۔

مہر کی ادائیگی سے مرد کی قوامیت کا ثبوت ملتا ہے اور اسلام نے حق مہر سے عورت کو تکریم بخشی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنی تفسیر میں سورۃ النساء کی آیت ۴ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مہر شریعت اسلامی میں بیوی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اس کے اولیاء کو دے کر ان سے بیوی حاصل کرتا ہے' بلکہ مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے جو شوہر بہ غرض اکرام و اعزاز براہِ راست عورت کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے''۔ لہٰذا اس کے ادا کرنے کے بعد شوہر اپنی بیوی کو اپنی زرخرید لونڈی تصور نہ کرے' بلکہ اس کو وہ مناسب مقام دے جس کی اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے۔ ❁❁

سَبّ و شَتَم

فساد کی جڑ اور بدترین گناہ

حافظ محمد زاہد☆

زبان کا بیہودہ‘ غلط اور ناجائز استعمال خواہ کسی بھی شکل میں ہو ’’گالی‘‘ کہلاتا ہے۔ عربی زبان میں گالی کو ’’سَبّ /شَتَم‘‘ کہا جاتا ہے‘ جس کے معنی اہلِ لغت نے یہ بیان کیے ہیں: ’’کسی دوسرے کے سامنے وہ بات کرنا جو اسے ناپسند ہو‘‘۔ اردو لغت کے مطابق گالی بدزبانی اور فحش گوئی کا نام ہے۔ دین اسلام میں گالی کو ایک سنگین جرم اور بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے‘ اس لیے کہ یہ بے شمار معاشرتی برائیوں مثلاً لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت جیسی مذموم خرابیوں کا باعث بنتی ہے۔ اسلام نے جہاں دوسری برائیوں کی مذمت بیان کی ہے وہیں اسلام نے گالی کی مذمّت میں بھی سخت روش اختیار کی ہے اور اس سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔

گالی گلوچ‘ منافق کی نشانی

منافق کی دو قسمیں ہیں‘ ایک عمل کا منافق ہوتا ہے اور ایک عقیدہ کا‘ اور یہ دونوں ہی قابلِ مذمت ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے گالی گلوچ کی مذمت میں اتنی شدت اختیار کی کہ گالی کو منافق کی ایک نشانی قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (۱)

’’چار چیزیں اگر کسی میں ہوں تو وہ پکّا منافق ہے اور اگر ان میں سے ایک ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (وہ چار نشانیاں یہ ہیں) (۱) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے

☆ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی لاہور

(۳) جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (۴) جب کسی سے جھگڑ پڑے تو آپے سے باہر ہو جائے (یعنی گالم گلوچ اور مار دھاڑ پر اُتر آئے)۔‘‘

گالی میں پہل کرنے والا گناہ گار ہوگا

اسلام نے ظلم و زیادتی کے حوالے سے یہ اصول بیان کیا ہے کہ جس پر جتنی زیادتی کی گئی ہے وہ اس کے بقدر بدلہ لے سکتا ہے۔ اس صورت میں سارا گناہ ابتدا کرنے والے پر ہوگا جب تک کہ مظلوم حد سے تجاوز نہ کرے۔ یہی اصول گالی گلوچ میں بھی لاگو ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِئِ مَالَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ)) (۲)

’’جب دو آدمی آپس میں گالی گلوچ کریں تو گناہ ابتدا کرنے والے پر ہی ہوگا جب تک کہ مظلوم حد سے نہ بڑھے۔‘‘

گالی کا جواب گالی سے دینے کی ممانعت

ایک طرف تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گالی گلوچ کرنے کا گناہ ابتدا کرنے والے پر ہوگا تو دوسری طرف اخلاقی طور پر یہ بھی ہدایت فرمائی کہ گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے‘ اس لیے کہ ایسا کرنے سے دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’ایک بار رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو (زبان درازی اور بدکلامی کر کے) ایذا پہنچائی تو حضرت ابوبکرؓ خاموش رہے۔ اس نے پھر حضرت ابوبکرؓ کو (زبان درازی کر کے) ایذا پہنچائی تو بھی وہ چپ رہے۔ اُس نے تیسری بار آپؓ کو تکلیف پہنچائی تو صدیق اکبرؓ نے اسے جواب میں کچھ کہہ دیا۔ جونہی ابوبکرؓ نے جواب دیا تو رسول اللہ ﷺ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ابوبکرؓ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپؐ مجھ پر ناراض ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((نَزَلَ مَلَكٌ مِنَ السَّمَاءِ يُكَذِّبُهُ بِمَا قَالَ لَكَ‘ فَلَمَّا انْتَصَرْتَ وَقَعَ الشَّيْطَانُ فَلَمْ اَكُنْ لِاَجْلِسَ اِذْ وَقَعَ الشَّيْطَانُ)) (۳)

’’آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا اور وہ اس بدزبان کی تکذیب کرتا رہا‘ پس جب تم نے اسے جواب دیا تو درمیان میں شیطان آ گیا‘ اور جس مجلس میں شیطان آ جائے تو میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔‘‘

گالی‘ نیکیوں کے ضیاع کا باعث

قیامت کے دن نیکیاں انسان کا واحد سرمایہ ہوں گی اور انسان ان کے بدلے جنت کی آرزو لگائے بیٹھا ہوگا‘ مگر گالی گلوچ کرنے والے شخص پر صد افسوس! کہ اس کی نیکیاں قیامت کے دن اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کو اس نے بلاوجہ گالی دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو اُمتِ مسلمہ کا ’’مفلس‘‘ قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ صحابہؓ سے سوال کیا: ((اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟)) ’’کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کسے کہتے ہیں؟‘‘ صحابہؓ نے کہا: اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ ’’ہم تو اُس کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس مال و متاع نہ ہو‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِیَامٍ وَزَكَاةٍ وَیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ))(۴)

’’قیامت کے دن میری امت کا مفلس وہ آدمی ہوگا کہ جو نماز روزے زکوٰۃ وغیرہ سب کچھ لے کر آئے گا‘ لیکن اس آدمی نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی‘ کسی پر تہمت لگائی ہوگی‘ کسی کا مال کھایا ہوگا‘ کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا‘ تو ان سب لوگوں کو اس آدمی کی نیکیاں دے دی جائیں گی‘ اور اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ اس آدمی پر ڈال دیے جائیں گے‘ پھر اس آدمی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘

ربّ العالمین کو گالی دینے کی ممانعت

اللہ وحدہٗ لاشریک خالق و مالکِ کائنات ہے اور کوئی بدبخت ایسا نہیں ہے کہ جو اللہ کو ایسی گالی دے جو انسان عام طور پر ایک دوسرے کو دے کر اشتعال دلاتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بنی نوعِ انسان ایسے عقائد بنا لیتے ہیں جسے ربّ العالمین اپنے لیے گالی سے تعبیر کرتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ كَذَّبَنِی ابْنُ آدَمَ وَلَمْ یَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ‘ وَشَتَمَنِیْ وَلَمْ یَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ‘ فَاَمَّا تَكْذِیْبُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ كَمَا بَدَاَنِیْ وَلَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ

عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِهٖ‘ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ فَقَوْلُهٗ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا وَاَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لِّیْ كُفُوًا اَحَدٌ))(۵)

’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم میری تکذیب کرتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے‘ اور وہ مجھے گالی دیتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بنی آدم کی تکذیب یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا جیسے میں نے پہلے پیدا کیا ہے حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ بنی آدم کی گالی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اولاد بنالی ہے حالانکہ میں اکیلا اور بے نیاز ہوں‘ نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ میں جنا گیا ہوں‘ اور میرا ہم سر بھی کوئی نہیں ہے۔‘‘

صحابیٔ رسول کو گالی دینے کی ممانعت

بنی نوعِ انسان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے فضیلت والا طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے‘ اس لیے اُن کی عزت و احترام ایک مسلمان کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کسی شخص کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنا یا ان کو گالیاں دینا اُنؓ کے مرتبہ میں سے تو کسی چیز کو کم نہیں کرسکتا لیکن اس شخص کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَاتَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ لَاتَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ‘ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا اَدْرَكَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ))(۶)

’’میرے اصحاب (رضی اللہ عنہم) کو گالی مت دو‘ میرے اصحابؓ کو گالی مت دو۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے‘ اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کردے تو اُن میں سے کسی ایک کے ایک مد یا اُس کے نصف کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔‘‘

مسلمان کو گالی دینا بدترین گناہ ہے

اسلام واحد دین ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے حقوق کا بھی خاص خیال رکھتا ہے۔ اسلام نے ویسے تو کسی کو بھی (چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم) گالی دینے سے منع کیا ہے‘ لیکن بنی نوع انسان میں سے مسلمان کو اس حوالے سے ایک خاص درجہ عطا فرمایا ہے کہ مسلمان کو گالی دینے کو فسق یعنی بہت سخت گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُهُ كُفْرٌ))(۷)

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔''

ماں باپ کو گالی دینے کی ممانعت

حقوق العباد میں والدین کے حقوق کی بہت اہمیت ہے اور قرآن پاک میں والدین کو ''اُف'' تک کہنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ والدین کو برا بھلا کہنے یا گالی نکالنے کا گناہ بہت زیادہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ' قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ نَعَمْ! يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَ يَسُبُّ اُمَّهُ فَيَسُبُّ اُمَّهُ))(۸)

''یہ بات بہت بڑے گناہوں میں سے ہے کہ کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے (بخاری کی روایت میں گالی کے بجائے لعنت کرنے کا ذکر ہے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! کوئی آدمی کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ (پلٹ کر) اُس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور کوئی کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ (پلٹ کر) اُس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔''

آج کل تو معاشرے میں ایسے بدبخت بھی موجود ہیں جو صراحتاً اور براہِ راست اپنے والدین کو گالیاں نکالتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ ان بدبختوں کا کیا حال ہوگا؟

ملازم کو گالی دینے کی ممانعت

آج کے جدید تہذیب یافتہ معاشروں میں مالک کا ملازم کے ساتھ گالی گلوچ کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا' حالانکہ ملازم کو اس پر بڑی کوفت ہوتی ہے' مگر وہ ملازمت چلے جانے کے ڈر سے دل ہی دل میں خون کے آنسو پی کر صبر کر جاتا ہے۔ ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپؐ کی دس سال تک خدمت کرنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَشْرَ سِنِيْنَ لَا وَاللّٰهِ مَا سَبَّنِيْ سَبَّةً قَطُّ وَلَا قَالَ لِيْ اُفٌّ قَطُّ وَلَا قَالَ لِيْ لِشَيْءٍ فَعَلْتُهُ لِمَ فَعَلْتَهُ وَلَا لِشَيْءٍ لَمْ اَفْعَلْهُ اَلَّا فَعَلْتَهُ(۹)

''میں نے دس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی اور اللہ کی قسم آپؐ نے مجھے کبھی گالی نہیں دی' کبھی مجھے اُف تک نہیں کہا اور جو کام میں نے کر لیا اس کے بارے میں کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اس کے بارے میں کبھی نہیں فرمایا کہ وہ کام کیوں نہیں کیا۔''

مُردے کو گالی دینے کی ممانعت

اسلام کی حقانیت کا ایک اور ثبوت ملاحظہ کیجیے کہ اسلام نے زندوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی گالی نکالنے اور ان کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے' اس لیے کہ اس میں دو گناہ ہیں: ایک مُردوں کے متعلقین اور رشتہ داروں کو تکلیف دینے کا اور دوسرا مُردوں کو گالی دینے کا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَتُؤْذُوا الْاَحْيَاءَ))(۱۰)

''مردوں کو گالی نہ دو کیونکہ اس سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔''

زمانہ یا دن کو بُرا کہنے کی ممانعت

ہمارے معاشرے میں یہ بات عام ہوگئی ہے کہ جس دن کسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ فوراً کہہ دیتا ہے: ''آج کا دن ہی بُرا ہے''۔ حالانکہ زمانہ یا دن کو برا کہنا اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ' بِيَدِي الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ))(۱۱)

''اللہ عزوجل فرماتا ہے: ابن آدم زمانے کو گالی دے کر مجھے تکلیف پہنچاتا ہے' حالانکہ زمانہ تو میں ہی ہوں' میرے ہی قبضہ قدرت میں تمام امور ہیں اور میں ہی رات اور دن کو گردش دیتا ہوں۔''

لعن طعن کرنے کی ممانعت

اسلام نے جہاں گالی سے منع کیا ہے وہیں لعن طعن کرنے سے بھی باز رہنے کا حکم دیا ہے' کیونکہ لعنت بھی ایک گالی ہے' بلکہ ایک اعتبار سے یہ بدترین گالی ہے۔ اس لیے کہ لعنت کا مطلب ہے: کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی بددعا دینا۔ اب آپ خود سوچیں کہ کسی شخص کو اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا دینا کتنی بڑی گالی ہے! حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَاتَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِهِ وَلَا بِالنَّارِ))(۱۲)

''نہ تم لعنت (بددعا) کرو اللہ کی لعنت کے ساتھ اور نہ اس کے غضب کے ساتھ اور نہ آگ (کے عذاب) کے ساتھ۔''

اس روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی ہے جبکہ ایک روایت

میں تو محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا کہ مؤمن لعن طعن اور بدکلامی کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ))(۱۳)

''مؤمن نہ طعن کرنے والا ہوتا ہے' نہ لعنت کرنے والا' نہ فحش گوئی کرنے والا اور نہ بدکلامی کرنے والا۔''

لعنت' قتل کے مترادف ہے

ماقبل بیان کردہ روایات سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ لعنت کرنا ایک قبیح فعل ہے جس کے معاشرہ میں بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لعنت کی قباحت کی شدت کو بیان کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے مؤمن پر لعنت کرنے کو مؤمن کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔ حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنْ لَعَنَ مُؤْمِنًا فَهُوَ كَقَتْلِهِ وَمَنْ قَذَفَ مُؤْمِنًا بِكُفْرٍ فَهُوَ كَقَتْلِهِ))(۱۴)

''اور جس نے مؤمن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کر دیا اور جس نے مؤمن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے بھی گویا اسے قتل کر دیا۔''

اسی بنا پر اہلِ ایمان کے لیے کسی صورت بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے مؤمن بھائی پر لعنت بھیجے۔ اس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی نصیحت ملاحظہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يَكُوْنَ لَعَّانًا))(۱۵)

''کسی مؤمن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لعنت کرنے والا ہو۔''

لعنت اپنے کرنے والے پر واپس آجاتی ہے

لعنت ایک قبیح فعل ہے جس کا مطلب کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا دینا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف لعنت کرنے سے منع فرمایا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی بلاوجہ کسی کو لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت اُس شخص پر واپس آجاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں ہوا کو گالی دی۔ آپؐ نے فرمایا:

((لَا تَلْعَنِ الرِّيْحَ فَاِنَّهَا مَاْمُوْرَةٌ وَاِنَّهٗ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ))(۱۶)

''ہوا کو گالی نہ دو' اس لیے کہ وہ (اللہ تعالیٰ کے) حکم کی پابند ہے' اور اگر کوئی شخص کسی چیز پر بغیر کسی وجہ کے لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت اُس کی طرف لوٹ آتی ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا غصے میں طرزِ عمل

انسان اپنی فطرت کے مطابق کبھی غصہ میں آجاتا ہے اور کبھی آپے سے بھی باہر ہوجاتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر ہمیں چاہیے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھیں۔ نبی اکرم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں' لیکن حالات کی سنگینی کے تحت کبھی آپؐ پر بھی غصے کے جذبات آجاتے تھے۔ اُس موقع پر آپؐ کا کیا رویہ ہوتا تھا' یہ نبی اکرم ﷺ کی دس سال تک خدمت کرنے والے سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔ لہٰذا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ملاحظہ کریں:

لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاحِشًا وَلَا لَعَّانًا وَلَا سَبَّابًا كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْمَعْتَبَةِ ((مَالَهٗ تَرِبَ جَبِيْنُهٗ))(۱۷)

''نبی مکرم ﷺ فحش گوئی کرنے والے' لعنت کرنے والے اور گالی گلوچ کرنے والے نہ تھے۔ ہم میں سے کسی پر اگر کبھی ناراض ہوتے تو فرماتے: ''اس کو کیا ہوگیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔''

غصے اور گالی گلوچ سے بچنے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ نے ہمیں غصے اور گالی گلوچ سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے گالی گلوچ کیا تو ان میں سے ایک شخص کی آنکھیں غصہ کے مارے لال پیلی ہوگئیں اور اس کی باچھیں پھولنے لگیں۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنِّيْ لَاَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا ذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ' لَوْ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ))(۱۸)

''بیشک میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ اسے کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے۔ اگر یہ کہے: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ (میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان کے شر سے) تو اس کا غصہ جاتا رہے گا۔''

خلاصہ کلام

ہمارے معاشرے میں گالی گلوچ اور لعن طعن کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہوتا جارہا ہے اور لوگوں نے گالی کو کئی طرح سے اپنی گفتگو کا حصہ بنالیا ہے: (۱) بعض لوگوں نے گالی کو اپنی

عادت بنالیا ہے کہ ہر بات پر گالی دینا اُن کی گفتگو کا لازمی حصہ ہے اور اِس کے بغیر اُن کی گفتگو پوری نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو اگر گالی سے روکا جائے تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ گالی ہماری عادت بن گئی ہے‘ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ (۲) بعض لوگ مزاحاً گالی دیتے ہیں اور سننے والی کی غیرت بھی شاید مزاح میں ’’مر‘‘ جاتی ہے اور اس طرح مزاح میں گالی دینے سے کسی کو کوئی عیب محسوس نہیں ہوتا‘ نہ گالی دینے والے کو اور نہ اُسے جسے گالی دی جارہی ہے‘ حالانکہ ماں بہن کی گالی پر انسان کا غصے میں آنا فطری بات ہے اور غیرت کی نشانی ہے۔ (۳) بعض لوگ غصے کی حالت میں گالی گلوچ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر ان سے گالی نہ دینے کی بات کی جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے کنٹرول نہیں ہوتا‘ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے غصے کو کنٹرول کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے جو ماقبل بیان ہوگیا ہے۔ (۴) بعض لوگ گالی دینے کو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے ملازموں کو گالی نہ دیں تو وہ کام نہیں کرتے‘ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ملازم کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے۔

الغرض! ہمارے معاشرے میں گالی عام گفتگو کا حصہ بنتی جارہی ہے اور لوگ اس طرف توجہ نہیں دیتے کہ یہ گالی گلوچ فساد کی جڑ اور بدترین گناہ ہے جسے کسی بھی طور اپنی گفتگو کا حصہ بنانا معاشرتی برائیوں کے ساتھ اللہ کے عذاب کو دعوت دینا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی برائیوں‘ بالخصوص گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے سے محفوظ رکھے۔ آمین یاربّ العالمین!

حواشی

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب علامة المنافق۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان خصال المنافق۔ واللفظ للبخاری۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب النهی عن السباب۔ وسنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ماجاء فی الشتم۔

(۳) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب الانتصار

(٤) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب تحریم الظلم۔ وسنن الترمذی‘ کتاب صفة القیامة والرقائق والورع‘ باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

(٥) صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب یقال لا ینون احد أی واحد۔

(٦) صحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابة‘ باب تحریم سب الصحابة۔

(۷) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب ما ینهی عن السباب واللعن۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب قول النبی ﷺ سباب المسلم فسوق و قتاله کفر۔

(۸) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب لا یسب الرجل والدیه۔ وصحیح مسلم‘ کتاب

الایمان‘ باب بیان الاکبر و کبائرها ۔واللفظ للمسلم۔

(۹) مسند احمد‘ کتاب باقی مسند المکثرین‘ راوی: انس بن مالك ص‘ ح: ۱۲۵٦۱

(۱۰) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ما جاء فی الشتم۔

(۱۱) صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب ﴿وما یهلکنا الا الدهر الایة﴾۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الالفاظ من الادب وغیرها‘ باب النهی عن سب الدهر۔

(۱۲) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ما جاء فی اللعنة۔

(۱۳) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ما جاء فی اللعنة۔

(۱٤) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب ما ینهی عن السباب واللعن۔

(۱٥) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ما جاء فی اللعنة۔

(۱٦) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة‘ باب ما جاء فی اللعنة۔قال ابوعیسیٰ هذا حدیثٌ غریبٌ۔ سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی اللعن۔

(۱۷) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب ما ینهی عن السباب واللعن۔

(۱۸) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب صفة ابلیس وجنوده۔

❁❁❁

بقیہ: مولانا وحیدالدین خان

وہ آنے والے کو پہچانیں‘ وہ اس کے لیے دعائیں کریں‘ اور عملی اعتبار سے وہ پوری طرح اس کا ساتھ دیں۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ‘ جولائی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱٦)

ہمیں یہ یقین ہے کہ مولانا وحیدالدین خان صاحب جیسے صاحب بصیرت وفراست‘ مسیح موعود و مہدیٔ زمان کو یقیناً پہچان چکے ہوں گے‘ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو خان صاحب کے بقول‘ وہ اندھے پن میں مبتلا اور تاریخ کے اس آخری امتحان میں بلاشبہ ناکام قرار پائیں گے۔ دعوی اور اعلان غیر ضروری اور لایعنی سہی‘ لیکن مسیح اور مہدی کی پہچان تو ضروری ہے نا۔ مولانا وحیدالدین خان صاحب نے کتاب وسنت کی نصوص کی مضحکہ خیز تاویلات کے ذریعے مہدی و مسیح کا اپنا ایک تصور قائم کیا ہے۔ ہم کتاب وسنت ہی کے دلائل کی روشنی میں اس کا مفصل جائزہ ان شاء اللہ اگلی قسط میں پیش کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ عربی زبان وادب کے اسالیب ان مفاہیم کو قبول نہیں کرتے جو خان صاحب نصوص سے زبردستی کھینچ تان کر نکالنا چاہتے ہیں۔ (جاری ہے)

❁❁❁

کلامِ اقبال - قرآن کے ترازو میں (۲)

پروفیسر عبداللہ شاہین

اقبال کا تصوّرِ اِبلیس

یہ تو بیان ہو چکا کہ اعلیٰ پایہ کا فلسفی اور شاعر ہونے کے باوجود اقبال کی ہر بات ''مستند'' اور ہر قول ''قولِ فیصل'' نہیں ہے' کیونکہ شاعر بہرحال شاعر ہی ہوتا ہے اور اس کے اشعار کا انحصار کلی طور پر حقائق پر نہیں ہوتا بلکہ کچھ نہ کچھ دار و مدار ''تخیلات'' پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کا ''تصوّرِ ابلیس'' قرآنی ابلیس کی شخصیت سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال پر آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تحسین و آفرین پر ہی مبنی ہے' نقد و نظر پر کچھ نہیں لکھا گیا' لیکن میں اس سلسلہ میں چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ البتہ میرا مقصدِ وحید بھی ''اقبالیات'' کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا ہے تاکہ کھرا کھوٹا' سونا اور پیتل الگ الگ ہو جائے۔ چنانچہ تنقیحاتِ کلامِ اقبال کا آغاز تحسینِ اقبال پر لکھی گئی ایک جامع اور پرمغز کتاب یعنی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ''فکرِ اقبال'' سے کرنا چاہتا ہوں' جس میں معترف و مؤیدِ اقبال نے کمال سخنوری سے کام لیتے ہوئے معنونِ مذکور کے بارے میں بعض نکات اٹھائے ہیں۔ جن میں سے:

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے کہ کیا ''ابلیس'' زندگی کے کسی مظہر کا نام ہے یا وہ کوئی آمادہ بہ شر شخصیت ہے؟ کوئی زوال یافتہ باغی فرشتہ ہے یا اس جِنّاتی مخلوق کا امام ہے جسے قرآن نے ناریُ الاصل قرار دیا ہے؟ (یہی مغالطہ سرسید کو بھی لاحق ہوا تھا جنہوں نے شیاطین اور فرشتوں کو حیات و کائنات میں جاری و ساری ''شر'' اور ''خیر'' کی مخصوص قوتوں کا نام دے دیا تھا)۔ (۱)

(۱) سید مودودیؒ اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' جلد ششم' ص ۱۰۹ پر لکھتے ہیں:
''موجودہ زمانے کے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ''جن'' کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ پرانے زمانے کے اوہام و خرافات میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے..... انہوں نے ◀◀

اس سوال کا سیدھا' سادہ (clear cut) اور صاف قرآنی جواب تو یہ ہے کہ:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکھف: ۵۰)

''وہ نوعِ جِنّات (۲) میں سے تھا' پس اُس نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی۔''

بلادلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ کائنات میں بس وہی کچھ موجود ہے جو اُن کو محسوس ہوتا ہے' حالانکہ انسان کے محسوسات کا دائرہ اس عظیم کائنات کی وسعت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو سمندر کے مقابلے میں قطرے کی نسبت ہے۔ یہاں جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ محسوس نہیں ہے' وہ موجود نہیں ہے — اور جو موجود ہے اسے لازماً محسوس ہونا چاہیے — وہ دراصل خود اپنے ذہن اور علم کی تنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اختیار کر لیا جائے تو ''جِنّ'' ہی کیا' انسان کسی ایسی حقیقت کو بھی نہیں مان سکتا جو براہِ راست اس کے مشاہدے اور تجربے میں نہ آتی ہو اور اس طرح تو (نعوذ باللہ) ربّ تعالیٰ کا وجود بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کجا یہ کہ وہ کسی اور غیر محسوس حقیقت کو تسلیم کر لے — مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرزِ فکر سے متاثر ہیں' مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے (جیسے سرسید اور ان کے بعض خوشہ چیں) انہوں نے تو ''جِن'' اور ''ابلیس'' اور ''شیطان'' کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو' بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی ''بہیمی قوتیں'' ہیں جنہیں ''شیطان'' کہا گیا ہے اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور ''پہاڑی قومیں'' ہیں' اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں ''جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے''۔ لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے ان کے اندر کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے۔

(۲) جِنّوں کی کئی قسمیں ہیں' جیسے:

(۱) عَامِر: جو عام انسانوں کی بستیوں میں رہتے ہیں اور بلاوجہ کسی کو تنگ نہیں کرتے۔

(۲) هَمَزَات: جنوں کی وہ قسم جو انسانوں کو برے کاموں پر اُکساتی ہے اور وسوسہ اندازی کرتی رہتی ہے۔

(۳) بُھوت: جو لڑکوں اور لڑکیوں کو ستاتے ہیں۔ ان کو بھوت کے علاوہ پریت اور آسیب بھی کہتے ہیں۔

(۴) عِفرِیت: جو جسامت کے لحاظ سے بہت عظیم الجثّہ اور طاقتور ہوتے ہیں۔ ایسے ایک جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے: ﴿قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ.....﴾ (النمل: ۳۹)

(۵) هَاتِف: ایسے جنات جو جنگلوں میں آواز دیتے اور چیختے چلّاتے ہیں۔

(۶) رِجَالُ الْغَیْب: ایسے جن جو ویرانوں میں بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتلا دیتے ہیں۔

(۷) شَهابه: یہ جِنّات بھی جنگلوں میں ہی رہتے ہیں۔ ◀◀

نیز بجوائے عبارتِ قرآنی ''ابلیس'' خود تسلیم کرتا ہے کہ:

﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ (الاعراف:۱۲)

''(اے ربّ!) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُس (آدمؑ) کو مٹی سے پیدا کیا۔''

لہٰذا اگر آدم (علیہ السلام) ایک شخص ہے تو ابلیس (لعنة الله عليه) بھی ایک مشخص کردار ہے۔ نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (الرحمٰن)

''(اللہ نے) پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی مٹی سے۔ اور پیدا کیا جِنّات کو آگ کی لپٹ سے۔''

لہٰذا کسی قسم کی تشکیک کی گنجائش ہی نہیں کہ جِنّات اللہ تعالیٰ کی ایک نوعِ مخلوق ہے جسے ''آگ'' سے پیدا کیا گیا ہے' اور ''ابلیس'' ان میں سے اوّلین فرد تھا جس نے اللہ کے حضور سرکشی کی۔

(۲) دوسرا ''نکتہ'' یہ اٹھایا گیا ہے کہ ''ابلیس'' اگر کوئی ایک شخصیت ہو تو وہ ایک وقت میں ایک جگہ عمل پیرا نظر آئے' مگر قرآن و حدیث میں شیطان کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں ان کے مطابق شیطان ایک تو نہ ہوا (کہ جگہ جگہ کارستانیوں میں مصروف بیان کیا جاتا ہے)۔ اس کا جواب بھی قرآن و حدیث میں بالکل واضح ہے کہ شیطان اکیلا نہیں بلکہ اس کی پوری ذرّیت بنی نوعِ انسان کی گھات میں ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (الاعراف:۲۷)

''بے شک وہ (ابلیس) اور اس کا پورا کنبہ تمہیں ایسی جگہ سے تاڑتا اور تاکتا ہے جہاں

(۸) مَارِد: جِنّات میں جو بہت سرکش ہوں ان کو مارد کہتے ہیں۔
(۹) ثَبَر: گریبان پھاڑنے' منہ پر طمانچے مارنے اور ایامِ جاہلیت کے نوحے پر اُکسانے والے جِنّات۔
(۱۰) خَنْزَبْ: نمازوں میں خلل ڈالنے والے جن (ان کا ذکر آگے حدیث میں آ رہا ہے)
(۱۱) اَعور: لوگوں کو زنا کی ترغیب دینے والے۔
(۱۲) مَسْبُوط: کذب و دروغ اور جھوٹ کی دعوت دینے والے۔
(۱۳) دَاسِم: گھر والوں کے عیوب دکھانے والے۔
(۱۴) زکنبور: بازاروں میں بری حرکات کرانے والے جِنّات۔

سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔''

کیونکہ ان کا مادۂ تخلیق ''آگ'' ایک لطیف عنصر ہے' اسی لیے وہ ''غیر مرئی'' ہیں۔

نیز فرمانِ باری ہوا:

﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ.....﴾ (الکھف:۵۰)

''(اے انسانو!) کیا تم اس (ابلیس) کو اور اس کی اولاد کو اپنا دوست بناتے ہو؟''

اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ رسولؐ میں ہے کہ:

((اِنَّ اِبْلِیْسَ یَضَعُ عَرْشَهٗ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاهُ فَاَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً اَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً)) (۱)

''بے شک ابلیس اپنا تخت (سمندر و دریا کے) پانیوں پر بچھاتا ہے اور اپنے لشکروں کو بھیجتا ہے (کہ انسانوں میں فتنہ گری کریں)' پس ان میں سے ابلیس کا مقرّب ترین وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ برپا کرتا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز کے مابین حائل ہو جاتا ہے اور میری قراءت و تلاوت میں مجھے بھلاتا ہے۔ فرمایا:

((ذَاكَ شَیْطَانٌ یُقَالُ لَهٗ خَنْزَبٌ' فَاِذَا اَحْسَسْتَهٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ)) (۲)

''وہ ایک شیطان ہے جسے 'خَنْزَب' کہا جاتا ہے' پس جب تو اسے محسوس کرے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کر شیطان کی اس قسم سے۔''

غرضیکہ ''ابلیس'' اور اس کی ذریت' اولادِ آدم کی ازلی و ابدی دشمن ہے۔ چنانچہ اللہ ربّ العزت اور مالک الملک نے اس کی شخصیت کا تفصیلی تعارف یوں کرایا:

﴿وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ (بنی اسراء یل)

''اور شیطان اپنے پالنے والے کا ناشکرا ہے۔''

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا﴾ (مریم)

''بے شک شیطان انتہائی رحم فرمانے والے رب کا نافرمان ہے۔''

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب تحریش الشیطان وبعثه سرایاه لفتنة الناس .....
(۲) صحیح مسلم' کتاب السلام' باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلاة۔

لہٰذا اس کی اس شقاوت و بدخصلتی کے باعث ''مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ'' کی طرف سے حکم ہوا:

﴿اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ﴿۱۳﴾﴾ (الاعراف) ''بے شک تو ذلیل ہے۔''

اور یہ کہ:

﴿وَاِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْۤ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ﴿۷۸﴾﴾ (صٓ)

''اور بے شک روزِ جزا تک تیرے لیے میری رحمت و رأفت سے محرومی ہے۔''

نتیجتاً خمیر آدمؑ اٹھانے والے اور خلقت و سرشتِ آدم و حوا علیہما السلام کے خالق' حنّان و منّان رب نے اپنے علمِ غیب اور علمِ محیط و قدیم کی بنیاد پر خبردار کر دیا:

﴿یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ.....﴾ (طٰہٰ:۱۱۷)

''اے آدمؑ! یقیناً یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے.....''

اور پھر تمام اولادِ آدم و حوا (علیہما السلام) کو حکماً فرما دیا:

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:۶)

''بے شک شیطان تم سب کا دشمن ہے' پس ضرور ہے کہ تم بھی اس سے دشمنی ہی اختیار کرو۔''

(۳) تیسرا سوال یہ اٹھایا گیا ہے: ''.....کہ خدا جو خیرِ مطلق ہے' اس نے ایسی ہستی کو پیدا ہی کیوں کیا؟ اور انسانوں کو ورغلانے کے لیے اس کو ایسی کھلی اجازت کیوں دی؟'' -مزید یہ کہ:

''ازروئے قرآن حیات و کائنات کی کوئی قوت خدا کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی' سب جگہ آئینِ الٰہی کارفرما ہیں اور مخلوقات میں سے ہر شے خدا کی مطیع ہے۔ یہ اطاعت طوعاً ہو یا کرھاً' اختیار سے ہو یا جبر سے۔''

اس سہ پہلو طویل سوال کا تفصیلی (categorical) جواب یہ ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمام خوبیوں سے متصف اور ہر نقص' عیب' خامی اور کمی سے مبرا' معریٰ و پاک ہے ﴿فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ لیکن خیر و شر ہر شے کا خالق بھی وہی ہے (وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی) البتہ فریقین مکلّف جن و انس اس کے کاسب (adopter) ہیں۔ یہ نہیں کہ زرتشتی' مجوسی اور ایرانی ثنویت کی طرح خالقِ خیر اور ہو (یعنی یزداں) اور خالقِ شر اور ہو (یعنی اہرمن) لہٰذا بحوالہ عبارتِ قرآنی: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یعنی سب کچھ اللہ کی تخلیق ہے۔ تاہم کُل کا کُل خیر اللہ کی طرف سے ہے: ﴿مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں جو بھلائی بھی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے'' ﴿وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ ''اور جو بھی مصیبت تم پر

آتی ہے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہے'' (النساء:۷۹)۔ رہا یہ سوال کہ اس خیرِ مطلق نے ابلیس جیسی ہستی کو پیدا کیوں کیا اور انسانوں کو ورغلانے کی کھلی چھٹی کیوں دی؟ تو مستحضر رہے کہ اُس نے اس کائنات کو کسی کی فرمائش' مشورے یا دباؤ کے تحت پیدا نہیں کیا' بلکہ اپنی مرضی (مشیت) اور ارادہ سے ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ اور مبنی بر حکمت ﴿مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ پیدا کیا ہے۔ اور حی و قیوم اور قدیم و قدیر جو چاہے کرے' اسے کوئی پوچھنے والا نہیں' وہ سب کی باز پرس کرنے والا ہے۔

دراصل اس قسم کے سوالات وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو قرآن مجید کے بالاستیعاب مطالعہ سے محروم اور اس کے مضامین سے نابلد ہیں' چاہے دُنیوی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ درجواب آں غزل' عرض ہے کہ اللہ جل جلالہ نے اپنے اختیارِ کُل (Ultimate Authority) کو بیان کرتے ہوئے یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (وہ جو چاہے پیدا کرے) کے الفاظ تو ایک سے زائد بار (جیسے سورۃ الروم' سورۃ الزمر میں) استعمال کیے ہیں۔ لیکن اس سوال کا قطعی' حتمی اور دوٹوک (clear cut) جواب عبارتِ قرآنی میں یوں ملتا ہے:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ﴿۲۲﴾ لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ﴿۲۳﴾﴾ (الانبیاء)

''پس اللہ' عرشِ بریں کا ربّ' پاک ہے ان تمام معائب سے جو اس کے بارے میں (کیوں' کیا' کب کی صورت) خیال کیے جاتے ہیں۔ جو بھی وہ کرے' اس کے کاموں کے بارے میں کوئی پوچھنے والا نہیں اور وہ (تمام مخلوقات) عند اللہ مسئول ہیں۔''

لہٰذا یہ کائنات نہ تو لھو و لعب (کھیل کود) اور دل لگی کا سامان ہے اور نہ ہی کارِ دارد یعنی بے کار و بیگار ہے۔ یہ تصور تو یونانی دیومالا (Greek Mythology) کا ہے جو فرضی کہانیوں اور اساطیر پر مبنی ہے' جس کے مطابق ان کے دیوتاؤں نے تفنّنِ طبع اور تفریح کے لیے دنیا کو پیدا کیا ہے' یا ہندومت کے مطابق ان کے بھگوان ''رام'' کی لیلا ہے۔ بحوالہ عبارتِ قرآنی: ﴿ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (صٓ:۲۷) یعنی یہ تو کافروں کا خیالِ باطل ہے۔

لہٰذا یہ کائنات' اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی تخلیق ہے۔ فضول' بے معنیٰ اور بے کار نہیں ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ فضولیات' لغویات اور ہزل و زوائد سے پاک ہے۔ ازروئے قرآن حکیم:

☆ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ﴾ (الحجر:۸۵)

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔''

☆ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ﴾ (صٓ:۲۷)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے مابین کی کائنات کو باطل نہیں بنایا۔''

☆ ﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ.....﴾ (الاحقاف:۳)

''ہم نے آسمانوں' زمین اور ان کے درمیان کی کائنات کو مبنی برحق پیدا کیا ہے۔''

☆ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ.....﴾ (الدخان:۳۹)

''ہم نے آسمانوں' زمین اور ان کے درمیان واقع کائنات کو دل لگی' کھیل کود اور کھلنڈرے پن سے تو نہیں بنایا' بلکہ ان کو مبنی برحکمت پیدا کیا ہے۔''

کائنات کی تخلیق صانع کی تفنّنِ طبع اور تفریح کے لیے ہے' یہ تو کافروں کی بدگمانی یا گمراہ شاعروں کا تخیل ہے' جیسے: ؎

واہ مولا! تیری بے پروائی
کی دنیا دی کھیڈ بنائی!

اور ؎

تخلیقِ کائنات کی دلچسپ بھول پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی! (نعوذ باللہ من ذٰلک)

یا نام نہاد دانشوروں اور ادیبوں کا مکتب فکر ہے' جنہوں نے اسے Divine Comedy (خدائی مذاق) قرار دیا۔ اسی طرح نوعِ جن اور اُن کے جدِّامجد ''ابلیس'' کو بھی بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا گیا۔ نیز وہ پیدائشی طور پر سراپا شر نہیں تھا' بلکہ اپنی آزاد مرضی سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے ''شریر'' بنا۔ چنانچہ وہ کوئی ''سازشی کردار'' نہیں جو کسی ''ریشہ دوانی'' یا خدا اور شیطان کی باہمی ملی بھگت اور گٹھ جوڑ سے تخلیق کیا گیا ہو۔ یہ مغالطہ فرنگی حکماء و مفکّرین کو ہوا' جنہوں نے Paradise Lost (جنت گم گشتہ) جیسی کتابیں لکھ ماریں' اور ایسے ہی مغربی فلاسفہ و حکماء اور نام نہاد دانشوروں کے زیر اثر اقبال سے بھی تسامح ہوا ہے جب وہ شیطان کو اللہ تعالیٰ کا ''محرمِ راز'' گردانتے ہوئے یوں رقم طراز ہے: ؎

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر!
مجھے معلوم کیا! وہ ''رازداں''☆ تیرا ہے یا میرا؟ (بال جبریل)

☆ پیش نظر رہے کہ ''شیطان'' کو اللہ تعالیٰ کا ''رازداں'' قرار دینا ایک بہتان اور خطرۂ ایمان ہے (کیونکہ نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ نے کوئی ڈرامہ نہیں رچایا کہ ابلیس کو سجدۂ آدمؑ کا حکم دے کر' خود ہی اس سے انکار کی ''کانا پھوسی'' بھی کر لی ہو' اور نہ ہی یہ کائنات کسی ''محلاتی سازش'' یا اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آئی ہے' بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علم قدیم اور امر حکیم کی بنیاد پر تخلیق کی گئی ہے)۔ اسی طرح بالِ جبریل کی اسی غزل کے مقطع میں بقولِ اقبال: ع زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟ ''زوالِ آدمؑ'' کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ''اپنا ہی زیاں'' گردانا ہے' جبکہ وہ ستودہ صفات ہر قسم کے زیاں اور ضیاع سے پاک اور وراء الورا ہے۔ اور اس سے اگلی غزل میں ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو' مجھ کو بھی شرمسار کر!

کہہ کر جنت سے آدم علیہ السلام کے اُتارے جانے پر سوالیہ نشان (؟) لگانا اور ''شرمساری و انتظار'' جیسی کمزوریاں اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کرنا ادب و احترام اور توقیر خداوندی کے خلاف ہے۔ دراصل یہ ''باخدا دیوانہ باشد'' جیسے شاعرانہ کلچر اور فیشن کا شاخسانہ ہے جو اقبال ایسے ترجمان القرآن کے شایان شان نہیں' بلکہ ''باخدا ہوشیار باش'' اسے زیبا ہے' کیونکہ یہ تو وہی سوچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انکارِ سجدہ کے بارے میں ابلیس سے پوچھا کہ ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ﴾ (الاعراف:۱۲) ''تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے باز رکھا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا؟'' تو اس نے اللہ کی حکم عدولی کو اپنے نفس و استکبار کی طرف منسوب کرنے کی بجائے اس کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کر دی اور بہتان طرازی کرتے ہوئے ﴿فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ﴾ کے الفاظ استعمال کیے کہ تو نے خود مجھے بہکایا اور پھسلایا۔ جبکہ ابلیسی سوچ کے مقابل آدم و حوا علیہما السلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ جب ان سے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کے بارے میں استفسار ہوا تو انہوں نے فوراً اس سہو کو اپنے نفوس کی طرف منسوب کرتے ہوئے عرض کیا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ یعنی اے ربّ! ہم نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ بلکہ کمالِ ادب تو اُسوۂ ابراہیمی ہے کہ وہ عرفان باری تعالیٰ سے اپنی قوم کو متعارف کراتے ہوئے یوں گل فشانی فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾﴾ (الشعراء)

''جب 'میں' بیمار ہوتا ہوں تو ''وہ'' مجھے شفا دیتا ہے۔''

یعنی ''بیماری'' کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور ''شفا'' کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی ہے' حالانکہ ''وبا'' اور ''شفا'' دونوں اللہ کے اختیار میں ہیں۔

سوال کے بقیہ حصہ ''ہر شے خدا کی مطیع ہے' اختیار سے ہو یا جبر سے'' کا جزوی جواب اس کے اندر ہی موجود ہے۔ یعنی اطاعت کے لیے جبر کے ساتھ جب اختیار کا پہلو بھی آ گیا تو اطاعت کے برعکس بغاوت کے لیے بھی کچھ نہ کچھ استطاعت و اجازت تو دے دی گئی نا! اگرچہ یہ صلاحیت اور اختیار محدود ہی ہو۔ چنانچہ انسان کے بس میں تو اس کی جسمانیت (anatomy) بھی نہیں ہے۔ آپ ہر روز شیو (shave) بنائیں' صبح کو پھر چہرے پر بال اُگے ہوئے ہوں گے۔ آپ کے ناخن بدستور بڑھتے رہیں گے اور آئے دن یا ہفتہ وار آپ کو ناخن کاٹنے پڑیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ اختیار بھی ہے جس کی منطقی اور خوبصورت مثال حضرت علی ؓ نے دی جبکہ جبر و قدر کا مسئلہ پوچھنے والے سائل کو آپؓ نے فرمایا: اپنی ایک ٹانگ اٹھاؤ! اُس نے آسانی سے فوراً ٹانگ اٹھالی۔ آپؓ نے فرمایا: دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤ! تو اس نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: دوسری ٹانگ کیسے اٹھاؤں کہ دونوں ٹانگیں بیک وقت اٹھانے سے انسان گر پڑتا ہے۔ اسی طرح شیاطینِ جنّ کے اختیارات بھی محدود ہیں' یعنی انہیں بھی صرف انسانوں کو ورغلانے کا اختیار ہے (جیسا کہ سائل نے خود اپنے سوال میں بھی ''ورغلانے'' کا لفظ ہی استعمال کیا ہے) چنانچہ وہ مارے باندھے سے انسان کو اللہ کی نافرمانی پر مجبور نہیں کر سکتے' بلکہ صرف برائی کا خوبصورت خیال اس کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور بدی کو اپنانے اور کر گزرنے کی صرف دعوت دیتے ہیں۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ اس خیال کو رد کر کے برائی سے بچ جائے یا اس وسوسہ پر لبیک کہتا ہوا بدی کو اپنا لے۔ بحوالہ الفاظِ قرانی' شیطان قیامت کے دن انسانوں سے کہے گا:

﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ﴾ (ابراھیم:۲۲)

''اور تم پر میرا کوئی زور نہ تھا (کہ میں تم سے زبردستی گناہ کراتا) سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں (برائیوں کی) دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی' لہٰذا مجھے مت ملامت کرو بلکہ اپنے آپ کو برا بھلا کہو اور کوسو!''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صرف جن اور انسان دو مخلوقات کو خیر و شر میں سے کسی بھی چیز کو اپنانے کا اختیار دیا ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝﴾ (الدھر) ''خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا''۔ اور حکمت یہ رکھی کہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملک:۲) ''تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے''۔ تا کہ دونوں مکلّف انواعِ جنّ و بشر کے لیے نتیجتاً جزا و سزا کا نظام جاری فرمائے۔ رہی یہ بات کہ انسانوں کو ورغلانے کی ابلیس کو کھلی چھٹی کیوں دی؟ تو

اصولِ خداوندی یہ ہے کہ ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ (النساء:۱۱۵) یعنی جن و انس میں سے ہر کوئی جس طرف پھرنا چاہے ہم اسے اسی طرف پھیر دیتے ہیں۔ بلکہ مزید فرما دیا کہ جو کوئی اللہ کا خوف رکھتے ہوئے متقی بننا چاہے تو ہم اس کے لیے تقویٰ کا راستہ آسان کر دیں گے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ (الیل) اور جب اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو کر ''لاپروا'' بننا چاہے تو ہم اس کے لیے بغاوت کا راستہ سہل کر دیں گے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ (الیل) چنانچہ جب ابلیس نے اپنے اختیار سے زہد و عبادت کو اپنایا تو جن ہونے کے باوجود زہد و ورع اور تقویٰ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کی جماعت میں شامل کر دیا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے حکمِ سجدہ سے اختیارِ خود سے انکاری ہوا تو راندۂ درگاہِ الٰہی ہو گیا اور اللہ کے باغیوں میں شامل ہو گیا اور ایسے باغیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ کلیہ اور سُنّت اللہ یہ ہے کہ وَاُمْلِيْ لَهُمْ (یعنی میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں)۔ چنانچہ جب اُس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج دیتے ہوئے کہا:

﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ﴾ (الاعراف:۱۷)

''میں تیری سیدھی راہ سے انہیں بھٹکانے کے لیے راستہ میں بیٹھوں گا۔ پھر ان کے سامنے سے' پیچھے سے' دائیں سے' بائیں سے ان (انسانوں) پر حملہ آور ہوں گا۔''

اور صرف اس باغیانہ کام کے لیے مہلت چاہی: ﴿قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ (الاعراف) ''وہ کہنے لگا: مجھے صرف قیامت تک مہلت دے دے''۔ تو اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں سے بے نیاز ہے' اسے کسی کی پروا نہیں ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝﴾ (الشمس) اس نے چیلنج قبول کر کے فوراً مہلت دے دی: ﴿قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝﴾ (الاعراف) ''فرمایا: تمہیں مہلت دی گئی''۔ ساتھ ہی سب طاقتوں کے مالک ربّ نے فرمایا:

﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ﴾ (بنی اسراء یل:٦٤)

''(جاؤ جو کرنا ہے کر لو!) ان میں سے جسے بہکانے کی طاقت ہے اسے اپنی پکار (اور دعوت) سے بہکا لے' ان پر اپنے گھوڑ سوار اور پیادہ لشکر چڑھ دوڑا اور ان کے مال و اولاد میں شریک ہو اور انہیں (جھوٹے خوبصورت) وعدے دے۔''

یہ مکمل پس منظر و پیش منظر اور امر واقعہ ہے مذکورہ ہمہ جہتی سوال کا' جو اس لیے بیان کر دیا گیا ہے تا کہ ابلیس پر اقبال کے اشعار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ہمہ جہتی پہلو تناظر تجزیہ ہو۔ (جاری ہے)

مولانا وحید الدّین خان

اپنے الفاظ کے آئینے میں

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

مولانا وحید الدین خان یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش اتر پردیش، بھارت کے ایک قصبہ اعظم گڑھ میں ہوئی۔ چار یا چھ سال کی عمر میں ہی ان کے والد محترم فرید الدین خان وفات پا گئے۔ ان کی والدہ زیب النساء خاتون نے ان کی پرورش کی اور ان کے چچا صوفی عبدالحمید خان نے ان کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ سے ہی حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں اس مدرسہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۴ء میں چھ سال بعد انہوں نے یہاں سے اپنی مذہبی تعلیم مکمل کر لی۔

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت میں شمولیت

اسی دوران مولانا مودودی رحمہ اللہ کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی، ہند میں شامل ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے بھی رکن بن گئے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان رسالہ 'زندگی' میں باقاعدگی سے لکھتے رہے اور ۱۹۵۵ء میں ان کی پہلی کتاب 'نئے عہد کے دروازے پر' شائع ہوئی۔ یہی کتاب بعد میں ان کی معروف کتاب 'مذہب اور جدید چیلنج' کے لیے بنیاد بنی اور اس کا عربی ترجمہ 'الاسلام یتحدی' کے نام سے مقبول عام ہوا۔ جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد مولانا وحید الدین خان صاحب نے ۱۵ سال کے بعد جماعت اسلامی کو خیر باد کہا۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو گئے لیکن ۱۹۷۵ء میں اسے بھی مکمل طور پر چھوڑ دیا۔

ذاتی دعوتی اور علمی کام کا آغاز

۱۹۷۰ء میں انہوں نے نئی دہلی میں ایک اسلامک سنٹر کا آغاز کیا اور ۱۹۷۶ء میں 'الرسالہ' کے نام سے ایک اردو رسالہ کا اجرا کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ہندی اور ۱۹۹۰ء میں انگریزی میں بھی 'الرسالہ' جاری کیا گیا۔ ۲۰۰۱ء میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر اور دعوت کے پھیلاؤ کے لیے 'سی پی ایس' یعنی 'سنٹر فار پیس اینڈ سپر چوئیلٹی' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔

مولانا وحید الدین خان تقریباً دو سو کتب کے مصنف ہیں، جو اردو، عربی اور انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کی معروف کتب میں تذکیر القرآن، اسلام دور جدید کا خالق، مذہب اور جدید چیلنج، تعبیر کی غلطی، رازِ حیات، دین کی سیاسی تعبیر، عقلیاتِ اسلام، پیغمبرِ انقلاب اور اللہ اکبر ہیں۔ انگریزی اور عربی کتابیں اکثر و بیشتر مولانا کی اردو تحریروں ہی کے تراجم ہیں۔

فکری بنیادیں

مولانا وحید الدین خان صاحب کی تحریروں کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ان کے دعوتی اور علمی کام کو آسانی کی خاطر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱) تذکیر، یعنی خان صاحب کی تحریروں میں تذکیر کا اسلوب نمایاں ہے۔ ۲) ردّ عمل کی نفسیات، یعنی خان صاحب کی پوری فکر ردّ عمل کی نفسیات پر قائم ہے۔ ۳) تجدد، یعنی خان صاحب کے افکار و نظریات میں تجدّد پسندی کے میلانات اور رجحانات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ۴) تنقیص، یعنی خان صاحب کی اپنے ماسوا پر تنقید، درحقیقت تنقیص ہے۔ ۵) اختیال، یعنی خان صاحب کے خیالوں میں ان کی اپنی بڑائی رچ بس گئی ہے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کی کسی بھی تحریر کو اٹھا کر دیکھ لیں، اس میں ان میں سے ایک، دو یا تین، چار بنیادیں ضرور مل جائیں گی۔ ہم، ان شاء اللہ، ان عوامل اور عناصر سے پروان چڑھنے والی خان صاحب کی فکر کا، ان کے الفاظ ہی کی روشنی میں، ایک مفصّل تجزیاتی مطالعہ پیش کریں گے۔

علاماتِ قیامت

کتاب و سنت میں قیامت قائم ہونے کی کچھ نشانیاں بیان کی گئی ہیں، جن میں ظہورِ مہدی، نزولِ عیسیٰ بن مریم، خروجِ یاجوج ماجوج، آمد دجال، دابۃ الارض کا نکلنا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ خان صاحب ان تمام علاماتِ قیامت سے متعلقہ نصوص کا اثبات کرتے ہیں لیکن ان میں تاویل کرتے ہوئے انہیں حقیقت کی بجائے ایسی تمثیل قرار

دیتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے خان صاحب کی ذات اور صفات کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔

مسیح موعود اور مہدیٔ زمان

مہدی اور مسیح علیہما السلام کے بارے میں خان صاحب کا موقف یہ ہے کہ دونوں درحقیقت ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تمام مذاہب میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے خاتمے سے پہلے ایک آنے والا آئے گا اور وہ ایک خصوصی رول ادا کرے گا۔ یہی تعلیم اسلام میں بھی ہے... حدیث کی کتابوں میں جو روایات آئی ہیں' ان میں اس سلسلے میں تین لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رجل مؤمن' مہدی' مسیح۔ بظاہر یہ تینوں الفاظ ایک ہی شخصیت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔''

(ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء' ص ۱۳)

ایک اور جگہ اسی کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''ایک حدیث (سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی اور مسیح' دونوں ایک ہی شخصیت کے علامتی طور پر دو الگ الگ نام ہیں۔ آخری دور میں ظاہر ہونے والی ایک ہی شخصیت ہے' جس کو کسی روایت میں رجل مؤمن کہا گیا ہے' اور کسی روایت میں مہدی' اور کسی روایت میں مسیح۔ ایک اعتبار سے' ظاہر ہونے والا شخص' اُمتِ محمدی کا ایک فرد ہوگا' اس اعتبار سے اس کو رجل مؤمن کہا گیا۔ دوسرے اعتبار سے وہ گم راہی کے عمومی اندھیرے میں ہدایت کی روشنی کو مکمل طور پر دریافت کرے گا' اس اعتبار سے اس کو مہدی کہا گیا ہے' یعنی ہدایت پایا ہوا شخص۔ ایک اور اعتبار سے وہ شخص اُمتِ محمد کے آخری زمانے میں وہی رول ادا کرے گا جو اُمت یہود کے آخری زمانے میں حضرت مسیحؑ نے انجام دیا تھا۔ گویا کہ یہ تینوں الفاظ ایک ہی شخصیت کے تین پہلوؤں کو بتاتے ہیں' نہ کہ الگ الگ تین مختلف شخصیتوں کو۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۴۱)

ایک اور جگہ مولانا لکھتے ہیں:

''حدیث کی روایتوں میں قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے شخص کے لیے تین الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رجل مؤمن' مہدی اور مسیح۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ تینوں کا رول ایک ہی بتایا گیا ہے' اور وہ دجال کو قتل کرنا۔ اس میں یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ تینوں سے مراد ایک ہی شخصیت ہے' ورنہ حدیث میں تینوں کے لیے الگ الگ رول بیان کیے جاتے۔'' (ماہنامہ الرسالہ' جولائی ۲۰۱۰ء' ص ۱۴)

خان صاحب کے نزدیک مسیح سے مراد آسمان سے نازل ہونے والا کوئی نبی نہیں بلکہ اُمتِ محمدیہ کا ایک عام فرد ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت مسیح آسمان میں زندہ ہیں اور آخری زمانے میں وہ جسمانی طور پر آسمان سے اتر کر زمین پر آئیں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ یہ تصور اگرچہ لوگوں میں کافی پھیلا ہوا ہے' مگر وہ اپنی موجودہ صورت میں نہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے اور نہ احادیث سے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں تقریباً دو درجن معتبر روایتیں ہیں جن میں مسیح کے ظہور کا بیان پایا جاتا ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی روایت میں صراحتاً یہ الفاظ موجود نہیں کہ مسیح جسمانی طور پر آسمان سے اتر کر زمین پر آئیں گے۔ اس سلسلے میں جو بات ہے' وہ صرف یہ ہے کہ روایتوں میں نزول اور بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مگر صرف اس لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مسیح آسمان سے اتر کر نیچے زمین پر آئیں گے۔ عربی زبان میں نزول کا لفظ سادہ طور پر آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے' نہ کہ آسمان سے اترنے کے معنی میں۔ اسی اعتبار سے مہمان کو نزیل کہا جاتا ہے' یعنی آنے والا۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۴۶)

ایک اور جگہ مسیح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسیح' امت مسلمہ کے ایک فرد کے مصلحانہ رول کا نام ہے' نہ کہ جسمانی طور پر آسمان سے نازل ہونے والی کسی پراسرار شخصیت کا نام۔ اُمّتِ مُسلمہ کے ایک فرد کا یہ رول عیسیٰ بن مریم کے رول کے مشابہ ہوگا۔ اس لیے اس کو اُمتِ مُسلمہ کا مسیح کہا گیا ہے۔''

(ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۰)

مسیح موعود اور مہدیٔ زمان کی صفات

مولانا وحید الدین خان صاحب نے اپنے تئیں احادیث کی تاویلات کی روشنی میں مسیح اور مہدی علیہما السلام کی کچھ صفات بیان کی ہیں تاکہ ان کی پہچان میں آسانی ہو۔ ہم ذیل میں ان صفات کو ان ہی کے الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:

۱۔ مہدی یا مسیح کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عام انسانوں جیسا ہوگا۔ مصلح ہوگا اور عالمی کمیونکیشن کے دور میں پیدا ہوگا۔ خان صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

''المہدی کوئی انوکھی چیز نہیں ہوگا' وہ عام مصلحین کی طرح ایک مصلح ہوگا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ عام مصلحین اور مجدّدین عالمی کمیونکیشن سے پہلے پیدا ہوئے' جب کہ المہدی کی امتیازی صفت یہ ہوگی کہ وہ عالمی کمیونکیشن کے زمانے میں پیدا ہوگا۔ اس بنا پر اس کی دعوتی

اور فکری جدوجہد کا دائرہ عالمی بن جائے گا‘ جب کہ اس سے پہلے مصلحین اور مجددین کا دائرہ صرف محلی اور مقامی ہوا کرتا تھا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جنوری ۲۰۱۱ء‘ ص ۴۲)

۲۔ مہدی یا مسیح کی دوسری خاصیت یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں پھیلے ہوئے غلط نظریات کا ابطال کرے گا‘ فکری کنفیوژن دور کرے گا اور اسلام کی ایک تعبیر پیش کرے گا جو معاصر غلط نظریات کی استدلالی موت کا باعث ہوگی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ آخر میں امت محمدی کے اندر ایک شخص اٹھے گا۔ حدیث میں اس کو المہدی کہا گیا ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں المہدی کا رول ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: یملأ الأرض قسطا وعدلا کما ملئت جورا وظلما (کتاب المهدی‘ ح: ۴۲۸۵) یعنی مہدی زمین کو قسط اور عدل سے بھر دے گا‘ جیسا کہ اس سے پہلے وہ جور وظلم سے بھر دی گئی تھی۔ اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے‘ وہ سیاسی اقتدار کے معنی میں نہیں ہے‘ بلکہ وہ نظریاتی توسیع کے معنی میں ہے... اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مہدی سے پہلے دنیا میں غلط نظریے کی عمومی اشاعت ہو جائے گی۔ مہدی اس کے بجائے یہ کرے گا کہ وہ دنیا میں صحیح نظریے کی عمومی اشاعت کرنے میں کامیاب ہوگا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جنوری ۲۰۱۱ء‘ ص ۴۲)

غلط نظریے کے ابطال سے مراد فتنہ دہیماء کے بعد پیدا ہونے والے فکری کنفیوژن کو دور کرنا ہے۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

’’قیامت سے پہلے آخری زمانے میں ایک دور آئے گا جس کو حدیث میں فتنہ دہیماء کہا گیا ہے۔ فتنہ دہیماء سے مراد: الفتنة السوداء المظلمة ہے‘ یعنی مکمل تاریکی کا فتنہ۔ دوسرے لفظوں میں اس کو فکری تاریکی (intellectual darkness) کہا جا سکتا ہے۔ فتنہ دہیماء سے مراد قیامت سے پہلے کا وہ زمانہ ہے جب کہ اشاعتی ذرائع کی کثرت کے نتیجے میں مختلف قسم کے افکار کا جنگل اتنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ لوگ فکری کنفیوژن میں جینے لگیں گے۔ اس نازک دور میں اللہ کی سنت کے مطابق‘ کسی بندۂ خدا کے ذریعے کامل سچائی ظاہر ہوگی۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جون ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

’’روایت کے مطابق‘ مسیح کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ ان کے زمانے میں خدا اسلام کے سوا تمام ملتوں کو ہلاک کر دے گا: یهلك الله فی زمانه الملل كلها الا الاسلام۔ (سنن ابی داؤد‘ کتاب الملاحم‘ باب خروج الدجال) اس سے مراد بقیہ ملتوں کی

جسمانی ہلاکت نہیں ہے‘ بلکہ ان کی استدلالی ہلاکت ہے... حدیث کے مطابق‘ استثنائی طور پر یہ کام مسیح انجام دیں گے‘ جب کہ دوسرے لوگ ایسا کرنے میں اپنے آپ کو پوری طرح عاجز پا رہے ہوں گے۔ یہ واقعہ مسیح کی شخصیت کی ایک پہچان ہوگا۔‘‘

(ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۵۱-۵۲)

۳۔ مسیح یا مہدی یا رجل مومن‘ جو درحقیقت ایک ہی شخص ہے‘ دجال کو قتل کرے گا۔ دجال کے قتل سے مراد اس کا نظریاتی قتل ہے۔ یعنی سائنسی دور میں لوگ سائنس کو بنیاد بناتے ہوئے خدا کا انکار کر دیں گے جبکہ مسیح اور مہدی کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ اس الحادی فتنے کا ردّ سائنسی دلائل ہی کی روشنی میں کریں گے۔ ایک جگہ مولانا اپنے موقف کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’حدیثوں کے مطالعے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دجال یا دجالیت دراصل سائنسی دور کا فتنہ ہے۔ سائنسی دور میں پہلی بار یہ ہوگا کہ کچھ لوگ دلائل کے نام پر حق کا ابطال کریں گے۔ وہ یہ تاثر دیں گے کہ حق‘ علمی ترقی کے مقابلے میں ٹھیر نہیں سکتا۔ پھر خدا کی توفیق سے ایک شخص اٹھے گا جو خود سائنسی دلائل کے ذریعے اس دجالی فتنے کا خاتمہ کر دے گا۔ وہ دجالی دلائل کو زیادہ برتر دلائل کے ساتھ بے بنیاد ثابت کر دے گا۔ یہ واقعہ‘ اپنی نوعیت کے اعتبار سے‘ تاریخ بشری کا پہلا واقعہ ہوگا۔ وہ دعوتِ حق کی عظیم ترین مثال کے ہم معنی ہوگا۔ اسی لیے اس کی بابت صحیح مسلم میں یہ الفاظ آئے ہیں: هذا أعظم الناس شهادة عند ربّ العالمين۔ یہ عظیم دعوتی واقعہ قیامت سے پہلے پیش آئے گا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۸-۱۹)

ایک اور جگہ خان صاحب اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ مہدی اور مسیح استدلال کے ذریعے دجال کے فتنے کو ختم کریں گے:

’’دجال کے قتل سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے کی روایتوں پر غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس قتل سے مراد استدلالی قتل ہے‘ نہ کہ جسمانی قتل۔ صحیح مسلم میں اس سلسلے میں جو لفظ آیا ہے‘ وہ حجیج ہے۔ حجیج کا مطلب ہے حجت اور دلیل کے ذریعے غالب آنے والا... دجال کا نظریاتی فتنہ تاریخ کا سب سے بڑا فتنہ ہوگا۔ اس لیے استدلال کی سطح پر اس کا خاتمہ کرنا بھی تاریخ کا ایک انتہائی عظیم واقعہ ہوگا۔ اسی بات کو صحیح مسلم‘ کتاب الفتن کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: هذا أعظم شهادة عند ربّ العالمين۔ اس حدیث میں واضح طور پر شہادت سے مراد جسمانی قربانی نہیں ہے۔ جسمانی قربانی میں عظیم اور غیر عظیم کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں شہادت سے مراد

گواہی ہے‘ یعنی دلائل ربانی کے ذریعے دلائل شیطانی کو آخری حد تک باطل ثابت کرنا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۴)

۴۔ مہدی یا مسیح صاحب معرفت ہوگا اور اس میں تجزیہ کی صلاحیت کمال درجہ میں ہوگی۔ ایک جگہ خان صاحب فرماتے ہیں:

’’مہدی دراصل اسی قسم کا ایک صاحب معرفت انسان ہوگا۔ اس کے اندر خدا کی خصوصی توفیق سے یہ صلاحیت ہوگی کہ وہ لفظی مغالطے کو سمجھ سکے‘ وہ خوش نما الفاظ اور حقیقی استدلال کے فرق کو جانے‘ وہ ایک گم راہ کن بیان کا تجزیہ کر کے اس کی گم راہی کھول سکے۔ اس کے اندر تجزیہ کی طاقت (power of analysis) کمال درجے میں موجود ہو‘ وہ محدد تبیین (precise description) کی صلاحیت کا حامل ہو۔ اپنی اسی معرفت کی بنا پر وہ خود الفاظ کے فتنے سے بچے گا اور دوسروں کے لیے الفاظ کے فتنے سے بچنے کا ذریعہ بنے گا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۳۷)

۵۔ مہدی یا مسیح کی ایک پہچان ان کا استثنائی رول ہوگا‘ یعنی وہ عام مصلحین یا اہلِ علم سے ہٹ کر ایک رول ادا کریں گے۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

’’حقیقت یہ ہے کہ آنے والے کی پہچان صرف ایک ہوگی‘ اور وہ اس کا استثنائی رول (exceptional role) ہے۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۳)

مہدی اور مسیح کے استثنائی رول کی مزید وضاحت میں خان صاحب لکھتے ہیں کہ مہدی معرفت وہدایت کا حامل اور امن کا نمائندہ ہوگا:

’’رجل مؤمن کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ اس کی معرفت استثنائی درجے کی معرفت ہوگی۔ مہدی کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وقت کے تمام سوالات میں وہ استثنائی طور پر درست رہنمائی دینے کی صلاحیت کا حامل ہوگا۔ مسیح کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ رافت اور رحمت بالفاظ دیگر امن (peace) کے اصول کا کامل معنوں میں اظہار کرے گا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۵)

خان صاحب کے نزدیک مہدی کا استثنائی رول یہ ہوگا کہ وہ سچائی اور معرفت کو پالے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کا ظہور‘ فتنہ دہیماء (تاریک فتنہ) کے زمانے میں ہوگا۔ اس وقت تمام لوگ معرفت حق کے بارے میں اندھیرے میں پڑے ہوئے ہوں گے۔ ایسے تاریک دور میں معرفتِ حق کی روشنی کسی کو صرف خدا کی خصوصی

توفیق سے مل سکتی ہے‘ یعنی وہبی طور پر‘ نہ کہ اکتسابی طور پر۔ سیاہ فتنے کے دور میں کوئی شخص نہ بطور خود سچائی کو پا سکے گا اور نہ وہاں دوسرا کوئی شخص موجود ہوگا جو اس کو سچائی کی روشنی دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فتنہ دہیماء کے دور میں کسی کو صرف خداوند ذوالجلال کی طرف سے ہدایت مل سکتی ہے۔ مہدی کا مہدی ہونا‘ اپنے آپ بتا رہا ہے کہ مہدی کی پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ مہدی اپنے ماحول کے برعکس‘ استثنائی طور پر ایک ہدایت یاب انسان ہوگا‘ جب کہ لوگ عمومی طور پر ہدایت حق سے محروم ہو چکے ہوں گے۔ مہدی ایک استثنائی انسان کا نام ہے‘ اور یہی استثنا وہ چیز ہے جس کے ذریعے پہچاننے والے اس کو پہچانیں گے۔ مہدی نہ خود اپنے مہدی ہونے کا دعوی کرے گا‘ اور نہ آسمان سے یہ آواز آئے گی کہ فلاں شخص مہدی ہے‘ اس کو مانو اور اس کا اتباع کرو۔‘‘

(ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۳۶)

۶۔ مہدی یا مسیح کوئی انقلابی یا سیاسی لیڈر نہیں ہوسکتا بلکہ یہ عارف باللہ ہوگا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

’’بعض لوگوں نے مہدی کو ہادی کے معنی میں لے لیا۔ اس خود ساختہ تصور کے مطابق‘ انھوں نے کہا کہ مہدی جدید دور کا ایک انقلابی لیڈر ہوگا‘ جو عالمی سیاسی نظام قائم کرے گا۔ مہدی کی یہ تعریف سرتاسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہدی جدید دور کا ایک عارف ہوگا۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء‘ ص ۳۹)

۷۔ کچھ لوگوں کو مہدی یا مسیح کی نسبت سچے خواب آئیں گے۔ یہ بھی مہدی یا مسیح کی علامات میں سے ایک علامت ہوگی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’اُس وقت اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید رؤیائے صادقہ (سچے خواب) کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق‘ جن لوگوں کے اندر سچی تلاش کا جذبہ ہوگا‘ ان کو مہدی کی نسبت تائیدی خواب دکھائے جائیں گے۔ یہ خواب گویا کہ مہدی کے حق میں تائید مزید کے ہم معنی ہوں گے۔ ایسے خوابوں کو دیکھنے والے اہل ایمان یہ یقین کر لیں گے کہ یہی وہ شخص ہے جس کی پیشین گوئی حدیث میں مہدی کے لفظ سے کی گئی ہے‘ اور پھر وہ دل سے اس کے ساتھی بن جائیں گے۔‘‘ (ماہنامہ الرسالہ: جون ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۱)

۸۔ مہدی یا مسیح یا دورِ آخر کے مجدد کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ قرآن اور دین اسلام کی غلط تعبیرات سے گزر کر دین حق کو سامنے لائے گا۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

’’اب یہ سوال ہے کہ دورِ آخر کے مجدد کی پہچان کیا ہوگی۔ اس کی پہچان بلاشبہ یہ نہیں

ہوگی کہ وہ کچھ بر عجوبہ صفات کا مالک ہوگا۔ اس کی پہچان بنیادی طور پر دو ہوگی۔ یہ دونوں چیزیں واضح طور پر قرآن اور حدیث سے معلوم ہوتی ہیں... دورِ آخر کے مجدّد کی سب سے پہلی علامت یہ ہوگی کہ وہ خدا کی خصوصی توفیق سے دین حق کو دوبارہ اس کی حقیقی صورت میں دریافت کرے گا۔ وہ ظاہری فارم سے گزر کر اسلام کی اصل سپرٹ کا فہم حاصل کرے گا۔ وہ قرآن کی مغالطہ آمیز تشریح سے گزر کر قرآن کے اصل پیغام کو سمجھے گا۔ وہ دین اجنبی کو اپنے لیے دوبارہ دین معروف بنائے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خدا کے دین کو دوبارہ اس طرح دریافت کرے گا، جس طرح اصحاب رسول نے اس کو دریافت کیا تھا۔ زمانے کے اعتبار سے، وہ بعد کا انسان ہوگا، لیکن معرفت کے اعتبار سے وہ اصحابِ رسول جیسی معرفت کا حامل ہوگا۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۵۰-۵۱)

۹۔ مہدی یا مسیح کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ عصری اسلوبِ کلام میں اسلام پیش کرے گا۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

''اس کی دوسری علامت وہ ہوگی جو قرآن میں پیغمبروں کی نسبت سے ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراهيم : ٤) ... اس آیت میں لسان سے مراد صرف زبان نہیں ہے، اس میں وہ تمام پہلو شامل ہیں جو ایک کامیاب زبان کا ضروری حصہ سمجھے جاتے ہیں، مثلاً وضوح، مؤثر اسلوب، ایسا کلام جو معاصر ذہن کو پوری طرح ایڈریس کرنے والا ہو وغیرہ۔ اس قسم کا طاقتور اسلوب کبھی اکتسابی نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ وہبی طور پر کسی ایسے شخص کو عطا ہوتا ہے جس سے خدا اپنے دین کی تبیین کا کام لینا چاہتا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۵۰-۵۱)

۱۰۔ مہدی یا مسیح اپنے مہدی یا مسیح ہونے کا اعلان نہیں کریں گے، یہ بھی ان کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

''واضح ہو کہ آنے والے کے بارے میں بہت زیادہ روایات آئی ہیں، لیکن ان روایتوں میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آنے والا اعلان کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرے گا، اور نہ ہی یہ کہا گیا ہے کہ اس کے معاصرین اعلان کے ساتھ اس کا اعتراف کریں۔ اس قسم کے اعلان کا ذکر روایتوں میں موجود نہیں۔'' (ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں غور وفکر کے بعد چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس آنے والے شخص کی پہچان یہ نہیں ہوگی کہ وہ اپنے بارے میں اعلان کرے گا۔'' (ماہنامہ الرسالہ:

جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۳)

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب آنے والا یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ وہ مسیح یا مہدی یا مجدّد ہے تو یقینی طور کیسے معلوم ہوگا کہ کون مسیح یا مہدی یا مجدد تھا؟ اس کے جواب میں خان صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا یقینی علم آخرت میں ہی حاصل ہوگا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہاں اس معاملے کی وضاحت ضروری ہے کہ مہدی اور مسیح کے مسئلے کو اصولی طور پر بیان کرنا ایک الگ چیز ہے اور خود اپنے بارے میں مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کرنا بالکل دوسری چیز... کون شخص مہدی تھا یا کس نے مسیح کا رول ادا کیا، اس کا تحقق صرف آخرت میں خدا کے اعلان کے ذریعے ہوگا۔ اس لیے دنیا میں اس قسم کا دعویٰ کرنا اپنے آپ میں ایک بے بنیاد دعویٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۴۰-۴۱)

۱۱۔ مہدی اور مسیح کی ایک پہچان یہ بھی ہوگی کہ معاصر مسلمان ان کا انکار کریں گے۔ ایک جگہ مولانا وحید الدین خان صاحب لکھتے ہیں:

''قدیم زمانے کے یہود نبی آخر الزمان ﷺ کے منتظر تھے، مگر ان کا حال یہ ہوا کہ جب پیغمبر آئے تو وہ ان کا انکار کرنے والے بن گئے۔ یقینی طور پر یہی واقعہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ہے۔ مہدی اور مسیح جب ظاہر ہوں گے تو موجودہ مسلمان یقینی طور پر ان کا انکار کرنے والے بن جائیں گے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: جنوری ۲۰۱۱ء، ص ۴۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ مہدی کا زمانہ فتنہ دہیماء کا زمانہ ہوگا۔ اس زمانے میں افکار کی کثرت کے نتیجے میں حقائق مشتبہ ہو جائیں گے۔ تمام لوگ فکری کنفیوژن میں جینے لگیں گے۔ ایسی حالت میں مہدی کے ظہور کے باوجود لوگوں کے لیے مہدی پر یقین کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لوگ دیکھیں گے کہ مہدی جو بات کہہ رہا ہے، وہ پوری طرح مبنی برحق ہے۔ لیکن مہدی عام انسانوں جیسا ایک انسان ہوگا، اس بنا پر لوگوں کے لیے شبہ کا ایک عنصر باقی رہے گا۔'' (ماہنامہ الرسالہ: جون ۲۰۱۰ء، ص ۱۱)

۱۲۔ مہدی یا مسیح کی ایک علامت یہ ہوگی کہ ان کے ساتھ اخوانِ رسول کی ٹیم ہوگی۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

''پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمہ طور پر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے لیے خدا نے آپ کو مضبوط افراد کی ایک ٹیم دی، جس کو اصحابِ رسول کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مہدی، یا مسیح جو کارنامہ انجام دیں گے، انھیں بھی خدا کی خصوصی مدد کے

ذریعے ایک طاقت ور ٹیم حاصل ہوگی۔ غالباً یہی وہ ٹیم ہے جس کو حدیث میں اخوانِ رسول کہا گیا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۴۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اخوانِ رسول سائنسی دور میں مسیح یا مہدی کے ساتھ مل کر دعوت کا کام کریں گے:

''غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اخوانِ رسول وہ اہلِ ایمان ہیں جو سائنسی دور میں پیدا ہوں گے، اور سائنسی دریافتوں سے ذہنی غذا لے کر اعلیٰ معرفت کا درجہ حاصل کریں گے، نیز یہی وہ لوگ ہوں گے جو مہدی، یا مسیح کا ساتھ دے کر آخری زمانے میں اعلیٰ دعوتی کارنامہ انجام دیں گے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۴۴)

جبکہ خان صاحب کے نزدیک اخوانِ رسول سے مراد ان کے قائم کردہ ادارے 'سی پی ایس' کی ٹیم ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''سی پی ایس انٹرنیشنل کے نام سے موجودہ دعوت کام جنوری ۲۰۰۱ کو دہلی میں شروع ہوا۔ لیکن اس تنظیم کے صدر نے اس دعوتی کام کو اس سے بہت پہلے ۱۹۵۰ میں اعظم گڑھ (یو۔پی) میں ادارہ اشاعت اسلام کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد یہ کام مسلسل بلا انقطاع جاری رہا۔ ۱۹۷۰ میں اسی مقصد کے لیے اسلامی مرکز (نئی دہلی) کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۷۶ میں اس نے الرسالہ مشن کی صورت اختیار کی۔ سی پی ایس انٹرنیشنل (۲۰۰۱) اسی کام کی تکمیلی صورت ہے۔ لمبی مدت کے بعد اب خدا کے فضل سے ساری دنیا میں یہ آواز پہنچ چکی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کی ایک طاقت ور ٹیم بن چکی ہے جس کو ہم سی پی ایس ٹیم کہتے ہیں۔ ماضی اور حال کے تمام قرائن تقریباً یقینی طور پر بتاتے ہیں کہ سی پی ایس کی ٹیم ہی وہ ٹیم ہے جس کی پیشین گوئی کرتے ہوئے پیغمبر اسلام نے اس کو اخوانِ رسول کا لقب دیا تھا۔'' (ماہنامہ الرسالہ: ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۴۰)

خان صاحب کے بقول سائنسی دور میں اخوانِ رسول مہدی یا مسیح کا ساتھ دیتے ہوئے دعوتی کارنامہ انجام دیں گے اور اخوانِ رسول سی پی ایس ٹیم ہے جو مولانا وحید الدین خان صاحب کے ساتھ مل کر سائنسی دور میں دعوتی کارنامہ سرانجام دے رہی ہے۔ اب مہدی اور مسیح کون ہوا؟ اس کا تعین ہم نہیں کرتے، کیونکہ مولانا نے تعین سے منع فرما دیا ہے اور پہچان پر زور دیتے ہیں۔

مہدی اور مسیح کی پہچان

قارئین کرام! مہدی یا مسیح یا مجدد یا رجل مؤمن کی مذکورہ بالا صفات کی روشنی میں اب

تک آپ یہ جان چکے ہوں گے کہ مسیح موعود اور مہدی زمان کون ہیں۔ مولانا وحید الدین خان صاحب کے نزدیک اگر اب بھی آپ مسیح موعود اور مہدیٔ زمان کو نہیں پہچان سکے تو آپ اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

''اس استثنائی صفت کے باوجود جو لوگ اس کو نہ پہچانیں، وہ اسی قسم کے اندھے پن میں مبتلا ہیں، جس اندھے پن کی بنا پر لوگوں نے پچھلے پیغمبروں کو نہیں پہچانا اور وہ ان کے منکر بنے رہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء، ص ۵۱)

خان صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ سے مطلوب یہ ہے کہ مسیح موعود اور مہدی زمان کو پہچاننے کی کوشش کریں اور ان کے مسیحیت یا مہدویت یا مجددیت کے کسی اعلان یا دعوے کا انتظار نہ کریں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''لوگوں سے یہ مطلوب ہوگا کہ وہ اعلان کا انتظار نہ کریں، بلکہ وہ رول کو دیکھ کر خود آنے والے کو پہچانیں اور اس کا ساتھ دیں۔ جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت نہ دے سکیں، وہ تاریخ کے اس آخری امتحان میں بلاشبہ ناکام قرار پائیں گے۔''

(ماہنامہ الرسالہ: جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۳)

پس اب جبکہ آپ پہچان چکے ہیں کہ مسیح موعود اور مہدی زمان کون ہے؟ اب آپ پر اس کی نصرت اور اعانت واجب ہے۔ ایک جگہ خان صاحب لکھتے ہیں:

''حدیث میں، آنے والے کی نسبت سے، یہ الفاظ آئے ہیں: **وجب علی کل مؤمن نصرہ واجابتہ** (أبو داؤد، کتاب المهدی) یعنی ہر مومن پر یہ واجب ہوگا کہ وہ اس کی آواز پر لبیک کہے اور اس کا ساتھ دے۔'' (ماہنامہ الرسالہ، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۵)

مسیح موعود اور مہدیٔ زمان کو پہچاننے کے بعد آپ کی ذمہ داری صرف اس کے حق میں دعا کرنا اور اس کی نصرت کرنا ہے، نہ کہ کوئی ایسا نعرہ لگانا ''مسیح موعود و مہدی زمان: وحید الدین خان، وحید الدین خان''۔ خان صاحب کے بقول، انہوں نے اپنے مسیح یا مہدی ہونے کا کہیں بھی دعویٰ نہیں کیا ہے اور ہمارے نزدیک بھی وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں۔ انہوں نے تو اصولی بحث کے نتیجے میں مسیح اور مہدی کی علامات اور پہچان بیان کر دی ہے اور معاصرین پر ان کی پہچان اور نصرت کو واجب قرار دیا ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے، ان کی ذمے داری یہ نہیں ہوگی کہ وہ شخصی تعیین کے ساتھ اپنے اعتراف کا اعلان کریں... البتہ معاصرین کی یہ لازمی ذمے داری ہوگی کہ

(باقی صفحہ 74 پر)

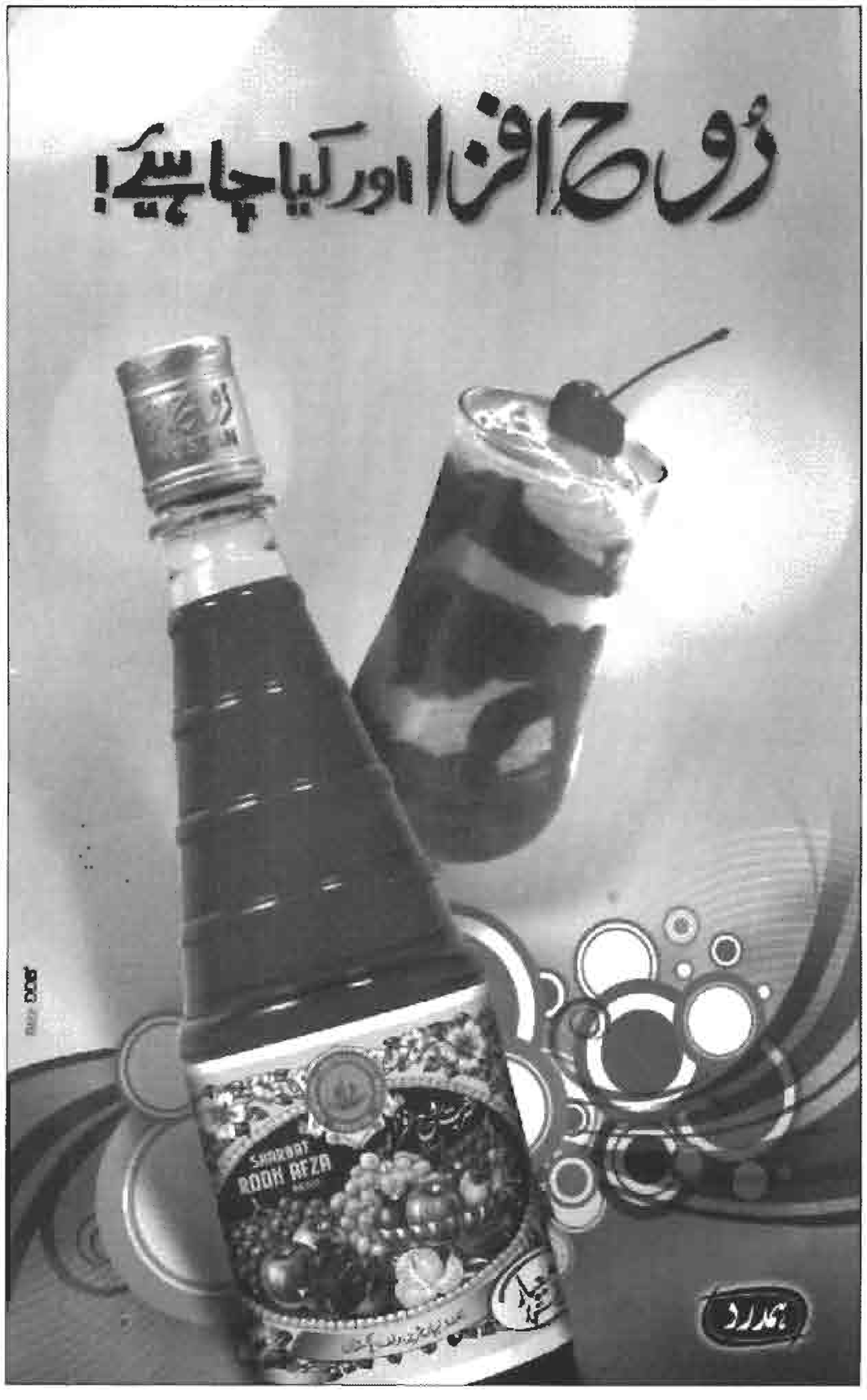

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیں!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 250 روپے

عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے

اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org